SIECT
www.shibliinternational.com
August 2020 اگست
ISSN: 2581-9216

ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد

Urdu Monthly **SADA E SHIBLI** Hyderabad

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

20/- روپے

Issue30 شمارہ-Vol:3 جلد

اگست:2020 Aug

ماہنامہ حیدرآباد

صدائے شبلی

مدیر: ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران: ڈاکٹر سراج احمد انصاری ☆ ڈاکٹر عبدالقدوس ☆ ابوہریرہ یوسفی

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، استاذ الاساتذہ حضرت رحمٰن جامی
پروفیسر مظفر علی شہ میری، پروفیسر محسن عثمانی ندوی
پروفیسر ابوالکلام پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی،
ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی، مولانا ارشاد الحق مدنی،
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی، اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ
محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق، ڈاکٹر حمران احمد، ڈاکٹر جاوید کمال
ڈاکٹر مختار احمد فردین، ڈاکٹر غوثیہ بانو، ڈاکٹر سید امام
حبیب قادری، ڈاکٹر سمیہ تمکین، ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ
ڈاکٹر محمد زبیر، ڈاکٹر مصطفیٰ خان، ڈاکٹر محمد فضیل ندوی،
ڈاکٹر مصلح الدین نظامی، ابوہریرہ ایوبی، محسن خان

قیمت فی شمارہ: 20
سالانہ: 220 - بیرونی ممالک: 50/امریکی ڈالر
خصوصی تعاون: 1000

MOHD MUHAMID HILAL
A/c: 52023475202 Bank: SBI
Ifsc: SBIN0020413
Micr: 500002311 Branch: Dabeerpura Hyd

ماہنامہ "صدائے شبلی" حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex,
Near Asfya Masjid Dabirpura Road, Purani Haveli, Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ (قسط:۲۷)	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
۴	ایمان بالآخرت	مولانا صدرالدین اصلاحی	۱۱
۵	آزاد ہندستان اور بنیادی انسانی حقوق	ڈاکٹر آصف لئیق ندوی	۱۳
۶	غزل	محمد ولی زاہد ہریانوی	۱۶
۷	انسانی مساوات کی بنیاد پر استوار مسلم سماج	احمد نور عینی	۱۷
۸	غزل	کنور ندیم مبارکپوری	۲۲
۹	جاتے ہوئے وہ سب کو رلاتا چلا گیا	ڈاکٹر صالحہ صدیقی	۲۳
۱۰	تقدیر میں ہو تو.....(ناولٹ، قسط:۲)	سیدہ زہرا جبین	۲۸
۱۱	یوم آزادی.....کیا ہم سچ میں آزاد ہیں؟	وزیر احمد مصباحی	۳۲
۱۲	ہم اپنے بچوں کی تربیت کیسے کریں	عبداللہ کمال اکمل	۳۶
۱۳	مراثی وفات غالب وقطعات تاریخ وفات (تبصرہ)	مولانا انصار احمد معروفی	۴۰

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

ابو سفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی.....الحاج **محمد منیرالدین عرف ولی**، آغا پورہ حیدرآباد
ڈاکٹر سید **جلیل حسین** ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد.....الحاج **محمد عبد الستار** سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد
علی میاں احمد پٹھان رائے گڑھ (مہاراشٹر).....**علی احمد عبد اللہ** کونچالی، رائے گڑھ (مہاراشٹر)
الحاج **رئیس احمد اقبال** انجینئر، سیکھ ویلج سکندرآباد حیدرآباد.....**محمد عبدالماجد** ایڈوکیٹ، سکندرآباد، حیدرآباد
جناب قاضی **فیض الدین**، اپر توڑیل، مہاڈ، رائے گڑھ مہاراشٹرا۔ ڈاکٹر **شہباز احمد**، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج
چارمینار، حیدرآباد.....مولانا **محمد عبدالقادر سعود** نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد۔
الحاج **محمد قمرالدین** نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

اپنی بات

ماہِ اگست ۲۰۲۰ء کئی اہم واقعات سے عبارت ہے، اس ماہ کی پہلی تاریخ کو پوری دنیا میں عیدالاضحیٰ منائی گئی، اس مہاماری کے دور میں بھی جذبۂ ابراہیمی کا خیال رکھتے ہوئے اصحابِ استطاعت نے قربانیاں کیں اور عالم کے سامنے یہ مثال قائم کی کہ دنیا کے حالات کچھ بھی ہوں، ہم قربانی کرنے اور قربانی دینے کے لیے تیار ہیں۔

۵/اگست ۲۰۲۰ء کو عدالت عظمیٰ کے غیر منصفانہ فیصلے کی بنا پر بابری مسجد کی جگہ وزیر اعظم نے رام مندر کی بنیاد رکھ کر ملک کے مسلمانوں کا دل توڑ کر اور ہندوؤں کا دل خوش کر کے ایک ایسی لکیر کھینچ دی کہ جس کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس گنگا جمنی تہذیب کمزور پڑتی نظر آرہی ہے، اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ اس غیر اطمینان بخش فیصلے کی قیمت مستقبل میں اس ملک کو چکانی پڑے۔

۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہمارا ملک انگریزوں کے چنگل سے آزاد ہوا، اس ملک کو آزاد کرانے میں سبھی کا خون شامل ہے، تاہم مسلمانوں کی کامیاب کوششیں نمایاں ہیں، جس کی شہادت تاریخ کے اوراق اور انڈیا گیٹ پر مجاہدوں کے نام کی تختیاں دے رہی ہیں، مگر افسوس تہتر سال بعد بھی اس ملک کے مسلمان تقریباً ہر شعبۂ حیات میں حاشیے پر ہیں، جس کی وجہ سے مقصد آزادی فوت ہوتا ہوا نظر آرہا ہے۔

۳۰/اگست کو ۱۰/محرم الحرام عاشورہ بھی آرہا ہے، جو اس دارِ فانی کا اول و آخر ہے اور اس کے وسط میں تاریخ کے اہم واقعات رونما ہوئے ہیں، جس سے حق و باطل کا امتیاز ہوتا ہے، اسی دن واقعہ کربلا کا سانحہ پیش آیا تھا، جس کی روداد تاریخ کے ساتھ ساتھ دنیا کی تقریباً تمام زبان وادب میں موجود ہے، جس کا پیغام انفرادی اور اجتماعی طور پر لائق تقلید ہے۔ حق کے لیے باطل سے سمجھوتہ نہ کرنا اور جام شہادت نوش کر لینا، یہی کربلا کا سب سے عظیم پیغام ہے۔ موجودہ دور میں اس واقعہ کو مشعلِ راہ بنانا چاہئے، کیونکہ اس وقت تقریباً تمام عالم میں ظالم حکمرانوں کا بول بالا ہے اور وہ عالم اسلام پر بھی مسلط ہونا چاہتے ہیں۔ محمد علی جوہر نے اپنے ایک شعر میں اس واقعہ کی حقیقت واضح کر دی ہے کہ ؎

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اردو زبان وادب کے دو عظیم خدمت گزار یعنی روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد کے چیف ایڈیٹر عالی جناب خان لطیف محمد خان اور مشہور و مقبول شاعر عالی جناب راحت اندوری اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان اور متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین)۔ ادارہ ان کی ادبی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

جود وسخا:

کھانے پینے کی چیزوں میں معمولی سے معمولی چیز بھی تنہا نہ کھاتے بلکہ تمام صحابہ کو شریک فرما لیتے، کسی غزوہ میں ۱۳۰ صحابہ ہم راہ تھے، آپ نے ایک بکری خرید کر ذبح کروائی اور کلیجی کے بھوننے کا حکم دیا، وہ تیار ہوئی تو تمام صحابہ کو تقسیم فرمایا، جو لوگ موجود نہ تھے ان کا حصہ الگ محفوظ رکھا۔

جو چیز آنحضرت ﷺ کے پاس آتی، جب تک صرف نہ ہو جاتی، آپ کو چین نہ آتا، بے قراری سی رہتی، ام المؤمنین ام سلمہؓ بیان کرتی ہیں کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ گھر میں تشریف لائے تو چہرہ متغیر تھا، ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ خیر ہے؟ فرمایا کل جو سات دینار آئے تھے شام ہوگئی اور بستر پر پڑے رہ گئے۔

حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ ایک شب کو وہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ ایک راستہ سے گذر رہے تھے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا، ابوذر! اگر احد پہاڑ میرے لیے سونا ہو جائے تو میں کبھی یہ پسند نہ کروں گا کہ تین راتیں گذر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جائے لیکن ہاں وہ دینار جس کو میں ادائے قرض کے لیے چھوڑوں۔

اکثر یہاں تک معمول تھا کہ گھر میں نقد کی قسم سے کوئی چیز موجود ہوتی تو جب تک کل خیرات نہ کر دی جاتی گھر میں آرام نہ فرماتے، رئیس فدک نے ایک دفعہ چار اونٹ پر غلہ بار کر کے خدمت نبویؐ میں بھیجا، حضرت بلالؓ نے بازار میں غلہ فروخت کر کے ایک یہودی کا قرض تھا وہ ادا کیا، پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر اطلاع کی، آپؐ نے پوچھا کچھ بچ تو نہیں رہا، بولے کچھ بچ بھی رہا، فرمایا کہ جب تک کچھ باقی رہے گا میں نہیں جا سکتا، حضرت بلالؓ نے کہا میں کیا کروں، کوئی سائل نہیں، آنحضرت ﷺ نے مسجد میں رات بسر کی، دوسرے دن حضرت بلالؓ نے آ کر کہا یا رسول اللہ! خدا نے آپؐ کو سبک دوش کر دیا، یعنی جو کچھ تھا وہ بھی تقسیم کر دیا گیا، آپؐ نے خدا کا شکر ادا کیا اور اٹھ کر گھر تشریف لے گئے۔

اسی طرح ایک بار عصر کی نماز پڑھ کر خلافِ معمول فوراً گھر کے اندر تشریف لے گئے اور پھر فوراً نکل آئے، لوگوں کو تعجب ہوا، آپؐ نے فرمایا، مجھ کو نماز میں خیال آیا کہ کچھ سونا گھر میں پڑا رہ گیا ہے، گمان ہوا کہ کہیں ایسا نہ کہ رات ہو جائے اور وہ گھر میں پڑا رہ جائے، اس لیے جا کر اس کو خیرات کر دینے کو کہہ آیا۔

غزۂ حنین میں جو کچھ ملا آنحضرت ﷺ اس کو خیرات فرما کر واپس آ رہے تھے، راہ میں بدوؤں کو خبر ملی کہ ادھر سے آنحضرت ﷺ کا گذر ہونے والا ہے، آس پاس سے دوڑ دوڑ کر آئے اور لپٹ گئے کہ ہمیں بھی کچھ عنایت ہو، آپؐ اژدحام سے گھبرا کر ایک درخت کی آڑ میں کھڑے ہو گئے، انہوں نے ردائے مبارک تھام لی، بالآخر اس کشاکش میں جسم اطہر سے چادر اتر کر ان کے ہاتھ میں رہ گئی، فیاض عالمؐ نے کہا "میری چادر دے دو، خدا کی قسم، اگر ان جنگلی درختوں کے برابر بھی اونٹ میرے پاس ہوتے تو میں سب تم کو دے دیتا اور پھر مجھ کو بخیل نہ پاتے، نہ دروغ گو نہ نامرد۔

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی۔ 9838573645

دیباچوں میں ذکر شبلی کا مطالعہ

بعض اور لوگوں کا بھی یہی خیال ہے کہ مولانا آزاد شبلی کی سیاسی فکر سے متاثر تھے۔

گذشتہ صفحات میں یہ ذکر آچکا ہے کہ علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے تھے اور ڈھائی برس تک اس عہدہ پر فائز رہے، اس کی بنیاد انھیں نے مستحکم کی لیکن اسی انجمن سے ان کی شخصیت اور خدمات پر دو بڑے حملے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی سکریٹری شپ کے زمانہ میں پہلے شعرالعجم کی تنقید مسلسل پانچ برس تک رسالہ اردو میں شائع کی، پھر اسے کتابی صورت میں شائع کیا۔ دوسرا حملہ خطوط شبلی میں ان کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے عطیہ فیضی کے حوالہ سے ان کی ذات کو مطعون کیا۔ چنانچہ ۶۲ ربرس بعد انجمن کے نائب صدر سید شہاب الدین دسنوی نے بابائے اردو اور اس قبیل کے دوسرے معترضین شبلی کا مدلل جواب لکھا، جسے انجمن ترقی اردو ہند ہی نے ۱۹۸۷ء میں شائع کیا۔ انجمن پر یہ بہت بڑا فرض تھا جسے اس نے ادا کیا، اس کتاب پر انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے ڈاکٹر خلیق انجم نے مقدمہ لکھا ہے، اس کا ایک ذیلی عنوان ''شبلی کی حمایت میں'' ہے۔ یہ مقدمہ کئی معنوں میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مذکورہ بالا تفصیلات پیش کرنے کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے لکھا ہے کہ:

''اگر شبلی پر الزامات کی ابتدا انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری مولوی عبدالحق نے کی تھی تو آج انجمن کے نائب صدر جناب سید شہاب الدین دسنوی ان الزامات کی مدلل تردید کررہے ہیں۔ اگر مولوی عبدالحق تنقید شعرالعجم کے محرک ہوئے تھے تو آج دسنوی صاحب ایک پوری کتاب چھاپ کر ان الزامات کو بے بنیاد ثابت کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ عام طور پر معاصرانہ چشمکیں اور ان کی تلخیاں متعلقہ ادیب اور شاعر کی زندگی ہی تک رہتی ہیں لیکن بعض مظلوم اور بدنصیب ادیب ایسے بھی ہیں جن پر اپنے عہد کی مخالفتوں اور چشمکوں کی پرچھائیاں آج تک موجود ہیں۔ ایسے ادیبوں میں علامہ شبلی کا نام سرفہرست ہے''۔ (شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں ص ۸، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۸۷ء)

اس تصریح کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے علامہ شبلی کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے اور ان پر کیچڑ اچھالنے کو قابل مذمت قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''شبلی عالم دین تھے۔ الفاروق، سیرۃ النبیؐ جیسے غیر فانی مذہبی شاہکاروں کے مؤلف تھے۔ فارسی اور اردو کے بہت بڑے اسکالر، ادیب اور نقاد تھے۔ موازنہ انیس و دبیر کا شمار بہترین تنقیدی تحریروں میں ہوتا ہے۔ شعرالعجم تمام تر کوتاہیوں کے باوجود اپنے موضوع پر واحد کتاب ہے۔ اس کتاب کا فارسی ترجمہ ہو چکا ہے اور اہل ایران اسے قابل قدر ادبی

کارنامہ سمجھتے ہیں۔ علامہ شبلی جیسی قد آور شخصیت پر کیچڑ اچھالنا قابل مذمت ہے''۔ (ایضاص ۸)

ڈاکٹر خلیق انجم نے شبلی شکنی میں ملوث مولوی عبدالحق، شیخ اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی کی تحریروں اور کتابوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

''ان حضرات نے علامہ کے بارے میں ایسی بے بنیاد، لغو اور مہمل باتیں کیں جو ہم عام آدمی کے بارے میں بھی کہنے سے پہلے کئی بار سوچیں گے۔ ان حضرات کی کتابوں سے ایک ایسی فضا بن گئی کہ تمام اہل اردو علامہ اور عطیہ کے تعلقات کو اسی روشنی میں دیکھنے لگے''۔ (ایضاص ۹)

ڈاکٹر خلیق انجم کو علامہ شبلی کے حامیوں اور قدر دانوں سے شکوہ ہے کہ انھوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی، لکھتے ہیں:

''شبلی کے حامیوں، قدر دانوں، معتقدوں اور شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ نہ جانے کیوں ان لوگوں نے الزامات کے تردید کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مقالوں میں تو کہیں کہیں صفائی پیش کی گئی ہے لیکن مدلل طریقہ سے کوئی معقول کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی۔ مجھے خوشی ہے کہ یہ سعادت میرے محترم سید شہاب الدین دسنوی کو نصیب ہوئی''۔ (ایضاص ۹)

اس کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم نے علامہ شبلی کے سیاسی شعور، بالغ نظری اور ان کی دانشوری پر اظہار خیال کیا ہے، تعلیم نسواں اور ان کی تربیت اور ان کے مرتبہ کی تعیین کے سلسلے میں علامہ شبلی کے خیالات کا تجزیہ کیا ہے، عطیہ کی ذہانت، درا کی اور تیزی وغیرہ بیان کی ہے، ان کا خیال ہے کہ اس خصوصیت کی وجہ سے نہ صرف علامہ شبلی بلکہ علامہ اقبال اور دیگر شخصیات کو انھوں نے متوجہ کیا، پھر شبلی پر گھناؤنے الزامات پر اظہار افسوس کیا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ:

''مجھے اس کا اعتراف ہے کہ اپنے محترم سید شہاب الدین دسنوی کی اس کتاب کا مسودہ پڑھنے سے پہلے میرے ذہن میں شبلی کی وہی تصویر تھی جو شیخ اکرام اور ڈاکٹر وحید قریشی نے پیش کی تھی۔ دسنوی صاحب کی دلیلوں نے مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ شبلی کی حمایت میں یہ پہلی معقول مکمل اور مدلل کتاب ہے، اس لئے مجھے یقین ہے کہ اب شبلی جیسے مظلوم انسان کے ساتھ انصاف ہوگا''۔ (ایضاص ۱۰)

ڈاکٹر خلیق انجم کا یہ چند صفحے کا پیش لفظ اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ کسی مقالہ سے کم نہیں۔

سید شہاب الدین دسنوی مرحوم کی یہ کتاب واقعی بہت عمدہ اور اپنے موضوع پر ایک اہم کاوش ہے۔ اس سے پہلے اس موضوع پر سب سے عمدہ تحقیقی بلکہ معرکۃ الآرا مقالہ ڈاکٹر ابن فرید نے لکھا تھا جس کا عنوان ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' ہے۔ یہ مقالہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا، یہ ایسا مدلل اور مسکت تھا کہ شیخ اکرام نے اپنی کتاب شبلی نامہ میں حک و اضافہ کر کے اس کا نام یادگار شبلی کر دیا، ڈاکٹر وحید قریشی نے ڈاکٹر ابن فرید کو خط لکھ کر اعتراف کیا اور اپنی ہی کتاب کو کتب خانوں سے غائب کرا دیا۔ بابائے اردو نے بھی ایک خط کے جواب میں شبلی کی مخالفت کی تردید کی۔ باوجود اس کے اب بھی نافہم اس کو دہراتے رہتے ہیں۔

سعید الرحمٰن اعظمی

ندوۃ العلماء کے مہتمم مولانا سعید الرحمٰن اعظمی (پ: ۱۴ر مئی ۱۹۳۵ء) نے ''علامہ شبلی اور ندوۃ العلما'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے، وہ اگرچہ موضوع کا حق ادا نہیں کرتا

تاہم مولانا مدظلہ علامہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی فکر ونظر کے بڑے قائل ہیں۔ ''مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی'' میں ان کی بھی تقدیم شامل ہے، انھوں نے علامہ شبلی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

''وہ روشن دماغ اور روشن ضمیر تھے، وہ اپنی تابناک زندگی میں یکتائے روزگار تھے، وہ وسیع الخیال، دور اندیش اور ایک شاداب فکر کے نمائندے تھے۔ وہ قدیم وجدید تقاضوں سے پوری طرح آشنا تھے۔ وہ اپنے عصر کے ممتاز عالم ومورخ اور ادیب تھے۔ وہ جس موضوع پر لکھتے اس کا حق ادا کردیتے اور ایسے نت نئے گوشوں کو عالم آشکارا کرتے کہ بڑے بڑے مورخین، اہل علم ودانش اور سنجیدہ فکر کے حامل حضرات بھی ششدر رہ جاتے اور ان کا علمی لوہا مانتے اور ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہوتے''۔ (مطالعہ تصنیفات علامہ شبلی نعمانی، تقدیم ص ۹)

علامہ شبلی تحریک ندوہ کے آغاز ہی سے اس سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اور اس کی بڑی خدمات انجام دیں، اس کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سعید الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں:

''علامہ شبلی ندوۃ العلما کے اولین معماروں میں ہیں، انھوں نے اپنے خون جگر سے اس علمی وفکری ادارہ کو سینچا اور اوج ثریا پر پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ یہی وجہ ہے کہ ندوۃ العلما کے اولین معتمد تعلیم قرار پائے اور ان کے تعلیمی تجربات سے ندوۃ العلما کو بہت فائدہ پہونچا، اس وقت ندوۃ العلما میں ان کی کئی یادگاریں ہیں جن میں رواق شبلی، رواق شبلی نعمانی اور کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی ہے۔ (ایضاص ۹۔۱۰)

علامہ شبلی ندوہ میں تھے تو معتمد تعلیم مگر انھوں نے ہر طرح سے خدمت کی، بیگم بھوپال سے مل کر ایک رقم منظور کرائی، پھر ریاست بھاول پور سے اس زمانہ میں پچاس ہزار کی رقم حاصل کی، حکومت سے ندوہ کے لئے زمین حاصل کی، اس کا نقشہ تیار کرایا اور تعمیرات کا آغاز کیا اور ایک دن خود مزدوروں کی طرح طلبہ کے ساتھ کام کیا اور اس کی کامیابی کے لئے رو رو کر دعائیں مانگیں۔

علامہ شبلی کو ابتدائے زمانہ سے کتابوں کے مطالعہ اور ان کو جمع کرنے کا شوق تھا یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس نوادر کتب اور مصادر کتب کا ایک بڑا ذخیرہ تھا جسے انھوں نے ندوہ پر وقف کردیا، پھر اپنے احباب نواب سید علی حسن خاں، نواب عماد الملک وغیرہ کے کتب خانے ندوہ پر وقف کرائے اور دراصل ندوہ کا کتب خانہ انھیں کی محنتوں ثمرہ ہے۔ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی نے ان باتوں کی طرف اشارہ نہیں کیا ہے اور شاید یہ اس کا موقع بھی نہیں تھا۔

علامہ شبلی جس طرح بڑے مصنف تھے، اسی طرح ایک بڑے خطیب بھی تھے، ان کے خطباب کا ایک مجموعہ دارالمصنفین سے شائع ہوچکا ہے، چند نو دریافت خطبات راقم کی کتاب ''نوادرات شبلی'' میں بھی شامل ہیں، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب نے علامہ کی ان خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''علامہ شبلی نعمانی میدان تقریر وتحریر کے شہسوار تھے، بلکہ صاحب اسلوب ادیب اور مصنف تھے۔ ان کی تصنیفات میں علمی اور تحقیقی رنگ غالب ہے، جن میں اکثر وبیشتر حالات وتقاضے کے پیش نظر لکھی گئی ہیں، اس لئے ان میں نہ صرف مقصدیت کی روح نمایاں ہے بلکہ مخالفین کے اعتراضات کو مثبت اور معقول انداز

میں رد کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے، بالکل اسی طرح علامہ عبدالحی حسنی جو علامہ شبلی کے نہ صرف معاصر بلکہ ندوۃ العلما کے رموز ہیں ان کی رہنمائی بھی علامہ شبلی کے لئے مشعل راہ تھی"۔ (ایضاً ص۱۰)

مولانا سید عبدالحی حسنی بلا شبہہ بڑے عالم و مورخ تھے، علمی و تصنیفی معاملات میں ان کا شبلی کی رہنمائی کا کہیں ذکر نہیں ملتا، اس کے برعکس خود علامہ شبلی نے ان کی رہنمائی کی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ نزہۃ الخواطر ہے، اس کے لکھنے کا مشورہ انھیں علامہ شبلی نے دیا تھا، خود انھوں نے لکھا ہے کہ:

"آج سے بیس برس پہلے میں نے عربی میں ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا جس میں ہندوستان کے عربی شاعروں کے حالات اور ان کے عربی اشعار اس طور پر درج کئے تھے جیسے کہ علامہ آزاد نے سرو آزاد یا ید بیضا وغیرہ تذکروں میں فارسی شعرا کے حالات یکجا کئے ہیں۔ مولانا شبلی کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ علمائے ہندوستان کے حالات میں اب تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی ہے، لہٰذا اس موضوع کو زیادہ وسیع کر دینا چاہئے، مجھ کو یہ مشورہ مولانا ممدوح کا پسند آیا"۔ (الندوہ لکھنؤ، اپریل ۱۹۱۵ء، بحوالہ افکار و شخصیات ص۱۱۳)

شمس الرحمٰن فاروقی

شمس الرحمٰن فاروقی (پ: ۱۹۳۵ء) عہد حاضر کے سب سے بڑے نقاد ہیں، گو ان کے دائرہ کار میں بڑا تنوع ہے تاہم وہ اصلاً نقاد ہی ہیں، دو درجن سے زیادہ ان کی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں، انھوں نے شبلی پر کم لکھا ہے، چند مقالات میں ان کا ذکر ضرور ہے، خاص طور پر غالب پر چار مقالات میں علامہ شبلی کا ذکر کثرت سے ہے، مگر مستقل مقالہ ان کے قلم سے ایک ہی نکلا ہے جو اردو ادب دہلی میں "شبلی کی فارسی غزل" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔

فاروقی صاحب نے مولانا عبدالسلام ندوی سمینار کے مجموعہ مقالات پر دیباچہ لکھا ہے جسے تقریظ کے نام سے شامل کیا گیا ہے، اس میں انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کے فکر و فن پر اظہار کیا ہے، اس میں انھوں نے مولانا عبدالسلام ندوی کے اسلوب بیان پر بھی تبصرہ کیا ہے چونکہ اس تجزیہ میں علامہ شبلی کا بھی خاصا اور خوب صورت ذکر ہے، اس لئے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

"لوگ عام طور پر مولانا سید سلیمان ندوی کو علامہ شبلی کا ادبی اور علمی جانشین قرار دیتے ہیں اور یہ بات بالکل صحیح ہے لیکن علامہ شبلی کے نثری آہنگ کی سلاست، دل نشینی اور شگفتگی کو اگر کسی نے پوری طرح حاصل کیا تو وہ مولانا عبدالسلام ندوی تھے۔ یہ درست ہے کہ علامہ شبلی کی نثر میں جو بے مثال شعریت تھی وہ ادق باتوں میں بھی ایک لذت پیدا کر دیتی ہے، موضوع چاہے جتنا علمی اور فکری ہو شبلی کو پڑھنے والا کبھی اکتاتا نہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی کی نثر میں وہ شعریت نہیں ہے لیکن دل نشینی ویسی ہی ہے۔ شبلی کے یہاں ایک ہلکی سی شوخی ہے گویا کوئی شخص مسکرا کر بعض بے تکلف دوستوں سے بات کر رہا ہو۔ انداز یہاں بھی علمی ہے، لیکن باقاعدہ محفل کا نہیں بلکہ آپس کی بات چیت کا، اس فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا عبدالسلام ندوی اور پھر علامہ شبلی کو پڑھئے تو دونوں طبیعتوں کا فرق نظر آئے گا، لیکن دونوں کی افتاد ذہنی ایک سی ہے"۔ (مولانا عبدالسلام ندوی کی دانشوری اور عصر حاضر ص۹۔۱۰، بمبئی، ۲۰۰۹ء)

مولانا صدرالدین اصلاحی (حیدرآباد)

ایمان بالآخرت

فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ (العنکبوت) ''پس اللہ ضرور ان لوگوں کو جان کر رہے گا جو (اس دعوے میں) سچے ہیں اور انہیں بھی جان کر رہے گا جو (اس دعوے میں) جھوٹے ہیں''۔

کیا یہ گمان ایک لمحہ کے لیے بھی کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ کون سچا مومن ہے اور کون جھوٹا اور ریاکار اور منافق؟ پھر اس ارشاد الٰہی کا مطلب کیا ہوا کہ ''اللہ نے جانا ہی نہیں'' یا یہ کہ ''اللہ ضرور جان کر رہے گا'' ظاہر ہے کہ اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ نفاق کا جو کھوٹ ان کے دل کی گہرائیوں میں چھپا ہوا ہے، اسے آزمائشوں کی بھٹی میں تپا کر باہر لایا جائے گا، تاکہ نافرمانی عمل کی سند سے یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ ایمان کے فلاں فلاں مدعی جھوٹے ہیں، وہ دعوت ایمان کے محاذ پر ہوتے ہوئے بھی اس کے دشمن ہیں اور ان کے ادعائے ایمان کی کوئی قیمت نہیں، اس لیے کہ ان کا عمل ان کے وعدے کے خلاف گواہی دے رہا ہے اور جب تک یہ گواہی اس دعوے ایمان کے حق میں نہ ہوجائے، اس کا کوئی وزن تسلیم نہیں کیا جاسکتا، نہ تو اللہ کے حضور، نہ ہی اس کے پیغمبر کے پاس، نہ ہی عام مسلمانوں کے لیے، چنانچہ جب منافقوں کے ایک گروہ نے اپنی بے عملی پر اظہار تاسف کیا تو اللہ نے ان سے فرمایا وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ (توبہ ۱۰۵) ''اے نبی ان سے کہہ دو کہ آئندہ اپنے عمل کا مظاہرہ کرو اللہ اور اس کا رسول اور تمہارے اہل ایمان تمہارے عمل کو دیکھیں گے اور پھر اسی کے مطابق تمہارے ایمان کی بابت فیصلہ ہوگا'' اسی طرح جب ایک جہاد کے موقع پر کچھ منافقوں نے جھوٹے بہانے کرکے نبی کریم ﷺ سے عدم شرکت کی اجازت لے لی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ آئی لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ (توبہ) تم نے انہیں کیوں اجازت دے دی؟ (تمہیں رکنا چاہئے تھا) یہاں تک کہ تم پر ان لوگوں کا حال روشن ہوجاتا جو (ایمان کے دعوے میں) سچے ہیں اور تم جھوٹے مدعیوں کو جان لیتے''۔

اگر وجودِ ایمان یا کیفیتِ ایمان کے باب میں عملی جائزے کا یہ اصول آپ کو تسلیم ہو، جیسا کہ تسلیم ہونا چاہئے، تو آیئے اپنے اعمال وافکار کا جائزلیں اور یہ دیکھیں کہ ہمارے دعویٰ ایمان بالآخرت پر ہمارے یہ اعمال وافکار کس رائے کا اظہار کرتے ہیں؟ شاید کوئی حقیقت پسند مسلمان جو رائے سننے سے انکار نہ کرے، ایک تلخ دل شکن صورت حال کا مشاہدہ کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ واقعات اسے یہ ماننے پر مجبور کردیں گے کہ قرآن کی جن آیتوں میں بنی اسرائیل کی بدکرداریوں اور آخرت فراموشیوں کی روداد مذکورہ ہے وہ ایک بڑی حد تک مسلمانوں کے حال پر بھی چسپاں ہورہی ہیں۔ وہ اس بات پر اطمینان کا سانس تو لے سکے گا کہ امتِ مسلمہ بحیثیت مجموعی فکرِ آخرت سے بے نیازی کے اس مقام تک نہیں پہنچی ہے، جہاں قوم یہود جا پہنچی تھی، مگر اس اعتراف سے وہ اپنے حساس اور مضطرب دل کو باز نہیں رکھ سکتا کہ اس امت کا ایک بڑا حصہ اپنے کم وبیش انہی صفات کا مظاہرہ کررہا ہے، جنہوں نے بنی

اسرائیل پر غضب الٰہی کی بجلیاں گرائی تھیں،۔ انفرادی زندگی میں ، اجتماعی معاملات میں، معاشرتی تعلقات میں، معاشی کاروبار میں، گھر میں، بازار میں حتیٰ کہ مدرسہ وخانقاہ تک میں جو کچھ ہورہا ہے اور برابر ہوتا رہتا ہے، اس کی تہہ میں وہ اگر فکر فرداں اور اندیشۂ آخرت کا کھوج لگائے گا تو پائے گا کہ اب مسلمانوں کی ایک بھاری تعداد نے اس فکر اور اندیشے سے اپنے دلوں کو گویا خالی ہی کرلیا ہے۔ اب یہ جو کام بھی کرنے اٹھتے ہیں، اس کے دنیوی فوائد اور مصالح سوچنے میں تو اپنے اوپر خواب وخور حرام کرلیتے ہیں، مگر فکرِ آخرت ان کے ذہنوں میں بار پانے کے لیے بس ایک اذن موہوم کا انتظار کرتی رہتی ہے اور اگر لاکھ آرزوؤں، خوشامدوں اور دعاؤں کے بعد یہ ساعتِ ہمایوں آتی بھی ہے تو بس اس کی ایک اجنبی مسافر یا زیادہ سے زیادہ ایک اجنبی مہمان کی حیثیت سے پذیرائی کی جاتی ہے، جس کی تکریم وضیافت کے لیے سَيَغْفِرُ لَنَا اور لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ کے سوا کوئی اور شئے مشکل ہی سے ملتی ہے۔ ان کا گمان ہے کہ خواہ ہم کچھ ہی کیوں نہ کریں، لیکن جب ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوچکے ہیں تو بہرحال بخشش ہمارے لیے یقینی ہوچکی ہے اور اللہ میاں ہمیں لازماً بخش دیں گے۔ اس قسم کے پندار باطل کا نشہ ایک کثیر تعداد کے دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ کسی میں اس کی تندی شدید تر ہے اور آنکھوں سے اس کا خمار ٹپکا پڑتا ہے اور کسی میں ذرا ہلکی ہے اور خاص اوقات ہی میں اس کا اثر محسوس ہوتا ہے۔ ایسے برخود غلط لوگوں کو چھوڑ کر امت کا ایک حصہ ضرور ایسا ہے، جس کے سامنے خوفِ آخرت ایک زندہ حقیقت بن کر موجود رہتا ہے، لیکن ان کی فکری اور عملی صلاحیتیں منتشر بھی ہیں اور بے وزن بھی، اس لیے اس کی موجودگی کا کوئی نمایاں اثر مسلمانوں کی قومی زندگی اور ان کے اجتماعی فکر وعمل پر پڑتا نظر نہیں آتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آخرت فراموشی، مادیت اور دنیا پرستی کا دھارا جس طرح سارے عالم کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے، اسی طرح اس امت کی کشتی حیات کو بھی کشاں کشاں اپنے رخ پر بہائے لیے جارہا ہے۔

شاید اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے ہمارا ذہن تیار نہ ہو، اس لیے کہ انسان کی جبلّت ہے کہ وہ دوسروں کے بخیے ادھیڑنے میں تو بڑا تیز دست ہوتا ہے اور اس کے جرائم کا اندازہ لگانے میں بڑا دیدہ ور بن جاتا ہے، مگر اپنے بارے میں اس کی ساری تیز دستی اور دیدہ وری دم بخود ہوکے رہ جاتی ہے اور اس وقت وہ ہر ممکن رعایت سے کام لینے پر اصرار کرتا ہے، اس لیے اصل صورت حال کو عریاں کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایمان بالآخرت کے اس اصلی اور سب سے بڑے معیار کی طرف توجہ دلائی جائے جو قرآن کا پیش کیا ہوا ہے اور جس کا حوالہ بنی اسرائیل کے ذکر کے سلسلہ میں اوپر آبھی چکا ہے، یعنی یہ کہ ”نماز کی اقامت ان لوگوں کے سوا اوروں پر بڑی ہی شاق ہے جو دل میں اللہ کا خشوع رکھتے ہیں، جو اس مر کا یقین رکھتے ہیں کہ ہمیں رب سے ملنا ہے“ (بقرہ) کیا ان لفظوں میں اس بات کا اعلان نہیں ہے کہ نماز (اقامتِ دین) ہی ایمان بالآخرت کا معیار ہے؟ اگر اس امر واقعی سے آپ کو انکار نہیں ہے تو ذرا ہمت سے کام لے کر اپنے حدود اربعہ کا جائزہ لے ڈالیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کیجئے کہ امت مسلمہ کا لقب رکھنے والی امت میں کتنے فی صدی نماز پڑھنے والے ہیں؟ ”نماز پڑھنے والے نہ کہ نماز قائم کرنے والے“ اس لیے کہ اس چھنی میں ڈال کر اگر چھاننے کی جرأت کیجئے گا تو شاید اس کے باریک سوراخوں سے بہت ہی تھوڑا جوہر چھن کر نکلے گا، اسی طرح اگر آپ پچھلی بحثوں پر غور وفکر کی نگاہ ڈالیں گے تو ایمان بالآخرت کا ایک اور معیار ہاتھ آئے گا اور وہ دنیوی مفاد کی قربانی کا معیار۔ یہ اوپر کی سطروں میں تفصیل کے ساتھ آچکی ہے کہ مومن اور منکر دونوں کے طرز فکر میں ایک بنیادی فرق بلکہ تضاد ہے۔

(قسط:۱)

ڈاکٹر آصف لئیق ندوی اردیلوی

آزاد ہندستان اور بنیادی انسانی حقوق؟!

ہمارا ملک دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے، جس میں مختلف ادیان و مذاہب کے لوگ بستے ہیں، ہندو اور مسلم کی آبادی دیگر مذاہب کی آبادی سے کافی زیادہ ہے، اس ملک کا ایک جمہوری دستور و آئین بھی ہے، انگریزوں سے آزادی کے بعد جملہ برادران وطن کے اتفاق رائے سے ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی سرپرستی میں حکومت، مقننہ، عدلیہ اور ملک کے دانشوران نے جو قوانین منظور کیے تھے، اسی کو ہم دستور ہند کہتے ہیں، جسکے سایے میں ستر سالوں سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے اور طویل مدت سے اسی دستور کے مطابق ہم لوگ مکمل آزادی کیساتھ اپنے اپنے مذہب و مسلک پر عمل، تعلیم و تربیت، اخلاق و کردار اور ملازمت و پیشے کا حصول، اپنے اپنے دین و شریعت، افکار و نظریات کی ترویج و اشاعت اور اپنی تہذیب و ثقافت کی بنیاد پر اپنی نسلوں کی پرورش و پرداخت کرتے چلے آرہے ہیں، جس میں کسی کو بھی اختلاف و نزاع اور حذف و ترمیم کا حق حاصل نہیں، خواہ قانون و دستور میں ترمیم کی کوشش مرکزی سطح سے کی جائے یا ریاستی پیمانے پر ہو یا وہ تبدیلی کسی قانون یا بل کے ذریعے بیک ڈور سے کی جائے؟! دستور سے چھیڑ چھاڑ کی اجازت حکومت وقت کو بھی حاصل نہیں ہے۔ اسلئے کہ آئین ہمارا متفقہ آئینہ حیات ہے اور ملک کا منظور شدہ قانون اور معاہدہ تحفظ حقوق انسانی بھی! جس میں سبھی مذاہب اور انکے پیروکاروں کے لیے بنیادی انسانی حقوق مندرج ہیں، اسی دستور و آئین کے ہم سب پاسباں و محافظ ہیں، جسکے ایک ایک حرف اور سطر کی حفاظت کے ہم سب ذمہ دار ہیں، عدلیہ، حکومت، مقننہ اور حفاظتی دستے سب اسکے محافظ و امین ہیں، ملک کے وزراء، صدر، نائب صدر اور چیف جسٹس وغیرہ اسکی بقا و تحفظ کی قسم کھاتے ہیں، اسکے مطابق فیصلے صادر کرنے اور نظام حکومت چلانے کا حلف بھی اٹھاتے ہیں، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دستور کی حفاظت و بقا ملک کی بقا و تحفظ ہے، یہی دستور ملک میں ابھی نافذ العمل بھی ہے۔ اللہ عزوجل دستور ہند اور ملک اور برادران وطن بشمول مسلمانوں کو ہر ایک کی نظر بد اور فتنہ پروروں کی فتنہ پروری سے محفوظ رکھے۔ آمین!

پندرہ اگست ہماری آزادی اور ۲۶ جنوری دستور ہند کے نفاذ کا دن ہے، جس میں ہم سب مل کر ہر سال خوشی اور جشن مناتے ہیں اور اخوت و مودت اور اسکی احیاء کا عہد کرتے ہیں اور اپنے پرکھوں کے کارناموں پر اعتزاز و فخر کے ساتھ ترانے گاتے ہیں، ابھی ہم پندرہ اگست کے جشن آزادی سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی ہیں، بلکہ ہر سال آزادی کے دن ترنگا جھنڈا تلے اپنی خوشی کا جشن مناتے ہیں اور متعدد پروگرام اور اس میں تقاریر و خطابات کے ذریعہ اپنی قوم و ملک کے بہادر و مجاہد پرکھوں کو جہاں ہم خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور انکی داستان لہو اور جان و مال کی عظیم قربانیوں کو یاد کرتے ہیں، وہیں ہم عملی طور سے اس بات کا اقرار بھی کرتے ہیں کہ جسطرح انہوں نے اخوت و مودت اور یکجہتی و یگانگت کا الگ الگ دھرم کے ہونے کے باوجود جو عظیم مظاہرہ کیا تھا، ہمارے حقیقی دشمنوں اور شر پسند عناصر سے متحد ہو کر لڑا تھا اور انکے خلاف سب سے پہلے مسلمانوں نے جہاد کا فتویٰ صادر کیا تھا اور عملا اپنی اپنی قربانیاں پیش کر کے ہمیں یہی سبق سکھایا تھا کہ ملک عزیز کو سامراجیوں کے غاصبانہ قبضے سے پاک و صاف کیا جائے

اورانہوں نے وہ کر دکھایا اور ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرایا اور ہندو مسلم کے باہمی مشورے، اتحاد و اتفاق، مساوات و برابری اور گنگا جمنی تہذیب کے اصول کو زندہ رکھنے کے لئے ملک میں جمہوری نظام و دستور نافذ کرایا، جس میں ہمارے لیے جینے، مرنے، لکھنے، پڑھنے، بولنے، سوچنے کی آزادی کیساتھ ساتھ اپنے مذہب پر عمل کرنے کا کھلی آزادی والا قانون درج ہے گویا ہم اور آپ آزادی کے دن جب اسکا جشن مناتے ہیں اور ترنگے جھنڈے کے حقیقی علمبردار ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں تو اسکے پیغام و تقاضے کا جامع پیکر بن کر اس جھنڈا تلے نفرت وعداوت سے بالاتر ہو کر جینے اور مرنے کا اپنے پرکھوں کا دیا سبق بھی دہراتے ہیں اور ۲۶ جنوری کو دستور ہند کے نفاذ کی خوشی کے دن بھی یہی آرزو وتمنا لیے ہوئے دعائیں کرتے ہیں اور اسکی احیاء وتجدید کے لیے عملا اپنی اپنی کمر باندھتے ہیں اور لسانی یہ معاہدہ بھی کرتے ہیں کہ آج بھی اگر ملک کو ہماری بلیدان کی ضرورت پڑے تو ہم سب متحد ہو کر جیسا کہ ہمارے پرکھوں نے میدان عمل میں متحدہ طور پر عظیم کارنامہ انجام دیا تھا اور دستور و آئین، ترنگے جھنڈے، بہترین ترانے، آزادی کے گیت اور مختلف نظموں اور طریقوں سے ہمیں آشنا کرایا تھا۔ آپسی دوستی اور بھائی چارے کا درس دیا تھا۔ ہم بھی اسی طرح قربانیاں پیش کرنے کو آج بھی تیار بیٹھے ہیں۔ انہیں باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے علامہ اقبال نے اپنا بیش بہا ترانہ قوم وملک کی یکجہتی اور بھائی چارے کی نذر کیا تھا۔ جسکا پہلا مصرع ہے۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اسکی یہ گلستاں ہمارا!!!!!!

مگر افسوس! جوں جوں وقت گزرتا گیا اور صحیح تعلیم وتربیت اور اخلاق وکردار سے ہماری دوریاں اور بے زاریاں بڑھتی گئیں، ہم اپنے کردار اور رویے سے اس عظیم درس وسبق کو فراموش کرتے چلے گئے اور آج بھی ہم اپنے پرکھوں کی اولاد ونسل ہونے کے باوجود اپنے قول وعمل میں تضاد اور مختلف تناقضات سے اپنے ملک کی اخوت ومودت، یکجہتی ویگانگت اور اتحاد واتفاق کی فضا کو درہم برہم کر رہے ہیں اور اسکے پرامن ماحول میں اپنے ہاتھوں سے خود ہی زہر گھول رہے ہیں، اپنے پرکھوں اور آباء واجداد کی محنتوں اور قربانیوں پر گویا ہم تیزاب اور پٹرول ڈال رہے ہیں، جنہوں نے ایک جٹ ہو کر انگریزوں کے ناپاک عزائم سے سونے کی چڑیا جیسے اس عظیم ملک کی سنسکرتی کو بچایا تھا، اپنے خون اور قربانیوں سے اس چمن کو سینچا تھا اور سامراجیوں کی غلامی سے ہمیں چھٹکارا دلا کر اسے گل گلزار بنایا تھا، آج ہم انکے ارمانوں پر پانی ڈال رہے ہیں اور ہندو مسلم نفرت و عداوت اور بھید بھاؤ کا بیج بو کر اس گل گلزار اور چمنستان علم وادب کو اجاڑ رہے ہیں اور ملک کی یکجہتی کو اپنی تخریبی سوچ وفکر سے نقصان پہونچا رہے ہیں، ہمارے پرکھوں نے ہر حال میں ہمیں متحد رہنے کی وصیت کی تھی اور ایکدوسرے کے دکھ درد کو بانٹنے اور آپسی خیر خواہی کرنے کی پرزور تلقین کی تھی، ہندو مسلم سکھ عیسائی سب ہیں آپس میں بھائی بھائی کا نعرہ بھی سکھا دیا تھا اور سبھوں کیساتھ انسانی ہمدردی کے احساسات وجذبات کو اجاگر کیا تھا اور اسکا نسخہ بھی دستور کی شکل ہمارے حوالے کر دیا تھا!! آج ہم مختلف سازشوں اور پروپیگنڈوں کے چکر میں پھنس کر اپنے ایکتا اور اتحاد واتفاق کے عظیم پیغام ونسخے کو اپنے مفاد کے حصول کی خاطر تار تار کر رہے ہیں اور اپنے بڑوں کی ناقابل فراموش بلیدان اور انکے مثالی سلوک و برتاؤ کو آپس میں لڑ جھگڑ کر ملیامیٹ اور خاکستر کر رہے ہیں، ہمارے پرکھوں نے حقیقی دشمنوں سے آزادی دلا کر دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہمارے حوالے اس لیے نہیں کیا تھا؟ کہ آج ہم آزادی کا جشن بھی منائیں؟ اسکے میٹھے گیت بھی گائیں؟ اور اخوت ومودت اور یکجہتی ویگانگت کے ترانے بھی گنگنائیں؟ اور دستور وآئین کے عظیم نسخے کو اپنے ناپاک عزائم ومقاصد کا ہدف اور نشانہ بنائیں؟ ملک کے عظیم اتحاد وایکتا کو فرقہ پرستی کی آگ میں جھونک دیں؟ نئی تعلیمی پالیسی ۲۰۲۰ کے

ہتھکنڈے کے ذریعہ رامائن، گیتا، ہندتو غرض کہ ایک ہی نظریہ حیات سے مربوط چیزوں کا پرچار و پرسار کریں اور باقی برادری کی نسلوں کے مستقبل کو تاریک بنانے کی راہ تلاش کریں؟ حد تو یہ ہے کہ انسان تو انسان حتی کہ زبان وادب سے بھی ہم اپنی دشمنی اور تنگ نظری کا ثبوت فراہم کرنے لگیں؟ اور جب بھی ضرورت پڑے تو نفرت آمیز بیان بازی کے ذریعے ہندو مسلم فسادات اور خون خرابے کے ناقابل بیان واقعات سے ملک کی جمہوریت اور اسکے آئین پر سوالیہ نشان کھڑا کرنے لگیں؟ اور بڑی آسانی کیساتھ صرف زبان سے آزادی کے گیت گاتے رہیں اور اپنے کردار سے جمہوری ملک کی روح ومزاج سے اپنی منافقت کا ثبوت دیں؟ اس سے کھلواڑ اور مذاق کا موقع فراہم کریں؟ کیا یہی ہماری گنگا جمنی تہذیب ہے، کیا یہی وہ ملک ہندوستان ہے جسے ہمارے آباء واجداد نے ہمارے سپرد کیا تھا۔ علامہ اقبال نے بہت پہلے انہیں باتوں کو محسوس کرتے ہوئے ہم سے کہا تھا۔ جس میں ہمارے لیے بڑی تنبیہ بھی ہے اور ہر مذہب کی تلقین بھی۔ کہ

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

کیا ہم آزادی کا جشن صرف اسلئے مناتے ہیں؟ تاکہ ہم مجاہد و بہادر پرکھوں، اپنی ہی قوم وملک اور اسکے دستور و آئین کیساتھ دوہرا رویہ اختیار کریں؟ دستور و آئین اور اس پر حلف کیساتھ اپنی بدعہدی کا مظاہر کریں؟ حقیقتاً ہمارا یہ رویہ ہمارے پرکھوں کی روح کو تکلیف پہونچا رہا ہوگا؟! کیونکہ یہ سراسر قوم وملک کے ساتھ بدعہدی اور مذاق ہے!! ظلم کی انتہا ہے کہ بعض شر پسند عناصر اور فرقہ پرستوں نے ملک کے پرامن ماحول میں اب یہ فتنہ اور وہم وگمان کی باتیں پھیلانا شروع کردیا ہے: کہ مسلمانوں کی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ہندوؤں کی آبادی کم ہوتی جا رہی ہے؟ اس لیے آج اگر روکا نہیں گیا تو کل اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آجائے گا؟ وغیرہ وغیرہ، بعض ناتجربہ کار برادران وطن خوف کے عالم میں ملک کے دشمنوں کی باتوں میں پھنستے نظر آرہے ہیں اور اس طرح وہ انکے سیاسی مفادات کا شکار بنتے جارہے ہیں، ملک کی دوسری معزز کمیونٹی سے کسی دوسری کمیونٹی کے لوگوں کو لڑانا اور انکے خلاف بے تکی اور بے سروپا باتیں گڑھ کر منافرت کی غرض سے پھیلانا کسی محبّ وطن اور شریف آدمی کا کام ہرگز نہیں ہوسکتا! یہ کہاں کا انصاف ہے؟ کہ ہم آزادی کا ترانہ بھی پڑھیں اور قوم وملک اور برادران وطن کیساتھ دوہرا معیار بھی اپنائیں؟؟ کیا ہمارے آباء و اجداد نے ایسا دوہرا معیار اپنی زندگی میں کبھی اپنایا تھا؟؟ ہرگز نہیں! ہرگز نہیں!!۔ شاعر نے ہماری موجودہ حالت کا ادراک کرتے ہوئے کل ہی کہہ دیا تھا۔

تجھے آباء سے اپنی کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار! وہ کردار! تو ثابت! وہ سیارہ!

ہمیں اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ حقیقی مجاہدین آزادی کے ذہن ودماغ میں وہ عظیم تصور آزادی سوار تھا جس کا ہم لوگوں نے ابھی تک صحیح سے ادراک بھی نہیں کیا ہے؟ مفاد پرستوں نے آزادی کے وقت بھی اپنے مفادات کا خیال ملحوظ رکھتے ہوئے، جنگ آزادی میں حصہ نہیں لیا تھا، انکو کیا معلوم کہ آزادی اور یکجہتی کیا چیز ہوتی ہے اور کس پرندے کا نام ہے۔ آج وہی ہمارے درمیان فتنہ پھیلا رہے ہیں! خواہ وہ لاکھ تدابیر اختیار کرلیں!! دستوری آزادی کا تصور جو ہمارے پرکھوں نے ہمارے ذہنوں میں پیوست کردیا ہے اور ہماری قوم وملک کو دستور کے ذریعے سمجھا دیا ہے، فرقہ پرست عارضی طاقت وقوت اور سازش وپروپیگنڈہ کے ذریعہ اس مستحکم یقین اور تصور آزادی کو ہرگز بدل نہیں سکتے!! کیونکہ آزادی ہمارا اور ہر شخص کا پیدائشی حق ہے، جیسے ہر بچہ آزاد پیدا ہوتا ہے ویسے ہی ملک کا ہر فرد اور انسان آزاد ہے، انکے حقوق اور وقار سب مساوی ہیں، ہر شخص سارے حقوق اور

ذہنی وفکری آزادی کا مستحق ہے، تمام انسان کو اپنی اپنی تہذیب و ثقافت کے دائرے میں اپنی زندگی گزارنے کا کامل اختیار حاصل ہے، آزادی کیساتھ اپنے اپنے مذہب پر عمل کرنے کا ہمیں قانونی حق ہے اور ملک کا قانون ہر شخص کو مساوی تحفظ فراہم کرتا ہے اور قانون کے سامنے سب برابر ہیں، جبرا کوئی اپنا دھرم نہ تو ہم پر اور نہ ہی ہماری نسلوں پر مسلط کرسکتا ہے!؟

ہمارے آباء واجداد نے ہمیں جو دستور وآئین دیا ہے، ہم اسکے کل بھی محافظ تھے اور آج بھی ہیں اور کل بھی رہیں گے، کسی بھی طاقت وقوت کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ ہمارے دستور سے کھلواڑ کریں؟: ہمارا دستور بتاتا ہے کہ کوئی بھی شخص بغیر کسی مداخلت کے اپنی سوچ وفکر اور اپنی تحریر ونگارش کے ذریعے کوئی بھی رائے اور مشورہ پیش کرسکتا ہے یا کسی بھی ذریعہ سے دوسروں تک اپنا پیغام پہنچا سکتا ہے، ہر شخص کو پرامن اجتماع، بنیادی انسانی حقوق کے حصول کے لیے اپنا احتجاج ومظاہرہ درج کرانے کا حق حاصل ہے اور اپنی الگ جماعت بنا کر اپنا پورا نظام حیات وتہذیب چلاسکتا ہے، زبردستی کسی کو اپنے مذہب وجماعت میں شامل کرنے کی ہرگز کسی کو اجازت نہیں دی جاسکتی!! اور نہ ہی اسکی طرف راغب کرنے کے لیے کوئی حرص وطمع اور فتنوں کا جال پھیلایا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی طرح سے کسی مذہب وزبان کو ٹارگٹ اور نشانہ بنایا جاسکتا ہے، اسی طرح ہر شخص کو قومی معاملات اور انتخابات میں حصہ لینے اور اپنا اپنا ووٹ ڈالنے کا پورا اختیار حاصل ہے، کسی ناحیے سے انکو بنیادی انسانی حقوق سے ہرگز محروم نہیں کیا جاسکتا اور ہر شخص کو قومی وریاستی ملازمت اختیار کرنے کا حق حاصل ہے غرض کہ ہر شخص ذمہ دار ہے کہ وہ متوازن ومستحکم معاشرتی وقومی نظام زندگی اور بنیادی انسانی حقوق کی بقاوتحفظ اور انکے فروغ وترویج کا کام انجام دے۔ جس میں کسی کو بھی مداخلت کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہیے۔ (جاری)

ولی محمد زاھد ھریانوی عثمان ساگر روڈ حیدرآباد

غزل

کورونا سے دُنیا میں ہلچل مچی ہے
سُپر پاوروں کی بھی نیند اُڑگئی ہے

کسی کا نہیں آج غمخوار کوئی
سبھی کو یہاں اپنی اپنی پڑی ہے

جو اپنا تھا وہ بھی کہاں ہے اب اپنا
کورونا کے ڈر سے بنا اجنبی ہے

کورونا کا خطرہ ہے خطرے سے باہر
سُپر پاوروں میں زبانی ٹھنی ہے

جہاں رقص ہوتا تھا دن رات اور اب
ذرا جا کے دیکھو وہاں سنسنی ہے

جُنوں میں وہ دینے لگا دھمکیاں بھی
عجب دوستوں سے تری دوستی ہے

نہیں زندگی کا بھروسہ ہی کوئی
قضا منتظر میرے سر پر کھڑی ہے

قیامت کے ظاہر ہیں آثار زاہدؔ
جو بارُود پہ ساری دُنیا کھڑی ہے

احمد نور عینی۔ پی ایچ ڈی اسکالر: جامعہ عثمانیہ

انسانی مساوات کی بنیاد پر استوار مسلم سماج

آپ ﷺ نے مساوات کی ایسی تعلیم دی کہ سماج سے رنگ ونسل اور قبیلہ وذات کا امتیاز مٹ گیا، غلام کو آزاد جیسی عزت وحیثیت ملی، حبشہ کے رہنے والے سیاہ رنگ کے آزاد شدہ غلام کو اتنی اہمیت وعزت دی کہ مکہ کے معزز ترین قبیلہ کے معزز ترین افراد ان پر رشک کیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے:

ابُو بَكْرٍ سَيِّدُنَا ، وَأَعْتَقَ سَيِّدَنَا يَعْنِي بِلَالًا .
(رواه البخاری فی باب مناقب بلال من كتاب أصحاب النبی صلی الله علیه وسلم برقم 3577 :)

حضرت ابوبکرؓ ہمارے سردار ہیں اور انھوں نے ہمارے سردار حضرت بلالؓ کو آزاد کیا ہے۔

سماج کی ایسی تربیت ہوئی کہ جس شخص کے اعمال وکردار اچھے ہوتے وہ معزز سمجھا جاتا چاہے وہ سیاہ رنگ کا غلام کیوں نہ ہوں، اور جس شخص کے اعمال وکردار برے ہوتے اسے برا سمجھا جاتا چاہے وہ عرب کے معزز ترین قبیلہ کا سردار کیوں نہ ہو، آپ ﷺ کی تعلیمات کے نتیجہ میں ایک ایسا سماج تشکیل پایا جس میں غلاموں نے اپنی قابلیت وصلاحیت کی بنا پر امامت وسیادت کے مناصب سنبھالے؛ چناں چہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے مکہ کے گورنر نافع بن عبدالحارث سے پوچھا کہ تم نے مکہ پر کس کو اپنا نائب بنایا ہے، انھوں نے کہا کہ ابن ابزی کو، حضرت عمرؓ نے پوچھا: کون ابن ابزی؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہمارا ایک آزاد کردہ غلام ہے، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم نے ایک آزاد شدہ غلام کو نائب بنایا ہے؟ انھوں نے کہا کہ وہ قرآن پڑھنے والا اور فرائض کا علم رکھنے والا ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا:

إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا ، وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ .(رواه مسلم فی باب فضل من يقوم بالقرآن من كتاب الصلاة برقم الحديث: 1407)

یقیناً اللہ اس کتاب کے ذریعہ کچھ لوگوں کا مقام بلند کرے گا اور کچھ لوگوں کو پستی نصیب کرے گا۔

مساوات کی تعلیم پر عمل کرنے کی وجہ سے مسلم سماج میں غلاموں کا مقام اتنا بڑھ گیا تھا کہ وقت کے حکم رانوں کو بھی تعجب ہوتا تھا۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ مجھ سے ہشام بن عبدالملک نے پوچھا کہ مکہ کا سردار کون ہے؟ میں نے کہا: عطاءؒ، اس نے پوچھا: یمن کا؟ میں نے کہا: طاوسؒ، اس نے پوچھا: شام کا؟ میں نے کہا: مکحولؒ، اس نے پوچھا: مصر کا؟ میں نے کہا: یزید بن ابی حبیبؒ، اس نے پوچھا: جزیرہ کا؟ میں نے کہا: میمون بن مہرانؒ، اس نے پوچھا: خراسان کا؟ میں نے کہا: ضحاک بن مزاحمؒ، اس نے پوچھا: بصرہ کا؟ میں نے کہا: حسن بن ابی الحسنؒ، اس نے پوچھا: کوفہ کا؟ میں نے کہا: ابراہیم نخعیؒ، امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ہر نام کے بعد وہ مجھ سے پوچھتا کہ ان کا تعلق عرب سے ہے یا موالی (آزاد شدہ غلاموں) سے، میں کہتا موالی سے، اخیر میں اس نے کہا:

اے زہری! بخدا موالی تو عرب کے سردار بن جائیں گے، حتی کہ منبروں پر ان کے نام کا خطبہ پڑھا

جائے گا اور عرب ان کے زیر نگیں رہیں گے، میں نے کہا: اے امیر المومنین! یہ اللہ کا اور اس کے دین کا معاملہ ہے، جو اس کی حفاظت کرے گا سردار بنے گا اور جو اسے ضائع کرے گا ناکام ونامراد ہوگا۔ (الباحث الحثیث شرح اختصار علوم الحدیث: 242)

اسی طرح کا ایک واقعہ ہے کہ ایک دیہاتی نے بصرہ کے ایک باشندے سے پوچھا کہ اس علاقے کا سردار کون ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ حضرت حسن بصریؒ، دیہاتی نے پوچھا کہ کیا وہ آزاد شدہ غلام ہیں؟ اس نے کہا: ہاں، دیہاتی نے پوچھا کہ پھر وہ سردار کیسے بن گئے؟ اس آدمی نے جواب دیا کہ لوگ ان کے علم کے محتاج ہیں اور وہ لوگوں کی دنیا سے بے نیاز ہیں، دیہاتی نے یہ سن کر کہا کہ قسم بخدا سرداری اسی کو کہتے ہیں۔ (حوالۂ سابق)

سماجی انصاف اور انسانی مساوات کی تعلیمات کا ہی یہ ثمرہ ہے کہ مسلمانوں کی تاریخ غلاموں کی حکومت کا سنہرا باب اپنے اندر رکھتی ہے، حکومت کے مختلف مناصب تو ہر دور میں غلاموں کو حاصل رہے؛ مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ زائد از ایک مواقع پر غلاموں نے باضابطہ حکومت کی باگ ڈور خود مختارانہ اپنے ہاتھ میں لی، مصر میں زائد از ڈھائی سو سال غلاموں نے حکومت کی، جو تاریخ میں دولۃ المماليک کے نام سے جانی جاتی ہے، یہ ایوبی سلطنت کے بعد 1250 میں قائم ہوئی اور 1517 تک قائم رہی۔ بھارت میں بھی غلاموں نے خود مختارانہ حکومت کی جو زائد از آٹھ دہائیوں پر محیط ہے، اور تاریخ میں اسے خاندان غلاماں کی حکومت سے جانا جاتا ہے، یہ محمد غوری کے انتقال کے بعد 1206 میں قائم ہوئی اور 1290 تک باقی رہی، اس کی بنیاد دہلی سلطنت کے پہلے حکمراں قطب الدین ایبک نے رکھی جو محمد غوری کا غلام تھا، گویا دہلی سلطنت کا آغاز غلاموں کی حکومت کے ذریعہ ہوا، غلاموں کی اس حکومت میں قطب الدین ایبک کے علاوہ دو اور غلام بھی بہت مشہور ہوئے، ایک شمس الدین التمش جو قطب الدین ایبک کا غلام تھا، اور دوسرے غیاث الدین بلبن جو التمش کا غلام تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے بعد خلفاء راشدین کا دور انسانی مساوات اور سماجی انصاف کا زریں دور ہے، اس دور میں انسانی اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں تھا، وقت کا حاکم اپنے کو ایک عام رعیت کے مانند سمجھتا، اور ایک عام شہری وقت کے حاکم کو روکنے اور ٹوکنے کی جرات اپنے آپ میں پاتا، قاضی عدالت کے سامنے عرب کا حکمراں ایک عام آدمی کی طرح پیش ہوتا اور قاضی عدالت اصولوں کی بنیاد پر اپنے حاکم کے خلاف فیصلہ صادر کرتا، حضرت ابوبکر جب خلیفہ بنے تو انھوں نے اپنے پہلے خطاب میں انسانی مساوات کی طرف توجہ دلائی اور فرمایا:

أما بعد! أيها الناس، فاني قد وليت عليكم ولست بخيركم، فان احسنت فأعينوني، وان أسأت فقوموني، الصدق أمانة، والكذب خيانة، والضعيف فيكم قوي عندي حتى أرجع عليه حقه ان شاء الله، والقوي فيكم ضعيف عندي حتى آخذ الحق منه ان شاء الله، ـــــ، أطيعوني ما أطعت الله ورسوله، فاذا عصيت الله ورسوله فلا طاعة لي عليكم۔ (البداية والنهاية: ج: ۳، ص: ۲۹۹)

اما بعد، اے لوگو، مجھے تم پر حاکم بنایا گیا ہے، حالاں کہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، اگر میں اچھا کام کروں تو میری مدد کرنا، اور اگر غلط کام کروں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ سچ امانت ہے، اور جھوٹ خیانت

ہے، تم میں کا کمزور میرے نزدیک طاقتور ہے، یہاں تک کہ میں اسے اس کا حق دلا دوں، تم میں کا طاقتور میرے نزدیک کمزور ہے یہاں تک کہ میں اس سے (کمزور کا) حق وصول کرلوں۔ ان شاء اللہ ۔میں جب تک اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کروں تم بھی میری اطاعت کرو، اور اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت نہ کرو۔

حضرت عمرؓ کے سفر بیت المقدس کی مثال تو مشہور ہے کہ حضرت عمرؓ اپنے غلام کے ساتھ بیت المقدس کے سفر پر روانہ ہوئے، سواری ایک تھی اور سوار دو، حضرت عمر نے یہ طے کیا کچھ دور میں سوار رہوں گا اور تم سواری کی نکیل پکڑ کر چلنا اور کچھ دور تک تم سوار رہنا اور میں سواری کی نکیل پکڑ کر چلوں گا، یہ دونوں سفر کرتے ہوئے شہر قدس پہنچے، جب بیت المقدس کے قریب پہنچے تو سوار ہونے کی باری غلام کی تھی اور نکیل پکڑنے کی باری حضرت عمر کی، غلام نے چاہا کہ حضرت عمرؓ سوار ہو جائیں اور وہ سواری کی نکیل پکڑ کر پیدل چلے؛ لیکن حضرت عمرؓ تیار نہیں ہوئے۔ اس سے بڑھ کر انسانی مساوات کی کیا مثال ہو سکتی ہے کہ وقت کی سپر پاور سلطنت کا حکمراں اپنے اور اپنے غلام کے درمیان کسی طرح کے امتیازی سلوک کو روا نہیں سمجھتا ہے، وہ غلام کو بھی سوار ہونے کا اتنا ہی حق دیتا ہے جتنا کہ خود کو دیتا ہے، وہ اس رویہ کو انسانی مساوات کے خلاف سمجھتا ہے کہ وہ تو سواری پر آرام سے بیٹھا رہے اور اس کا غلام نکیل پکڑ کر پیدل چلتا رہے۔

انصاف اور مساوات کا یہ کیسا اعلیٰ نمونہ ہے کہ مملکت اسلامیہ کا حاکم سواری کی نکیل پکڑ کر پیدل چل رہا ہے اور غلام سوار پر بیٹھا ہوا ہے، یہ اس وجہ سے تھا انھیں یہ سبق پڑھایا گیا تھا کہ ساری مخلوق ایک خاندان اور سارے انسان آپس میں بھائی ہیں، جو اپنے بھائی کے جتنا زیادہ کام آئے وہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم کے مطابق اتنا زیادہ افضل ہے، حضرت عمرؓ کی نماز جنازہ حضرت صہیبؓ نے پڑھائی جو کہ ایک آزاد کردہ غلام تھے، حضرت عثمان کے خلیفہ بننے تک مسجد نبوی میں امامت کے فرائض حضرت صہیب نے ہی انجام دیے، جس سماج میں غلاموں اور موالی کو سماج کا سب سے حقیر طبقہ شمار کیا جاتا تھا مسلم سماج میں وہ امامت کے مصلی تک پہنچا اور عرب کی معزز ترین شخصیات اس کی اقتدا کرتی نظر آئیں۔

ابتدائی دور کے مسلم سماج میں شاہ وگدا اور حاکم ورعایا کے درمیان تفریق کرنے والی غرور ونخوت کی دیواریں اس قدر بوسیدہ ہو چکی تھیں کہ حاکم وقت کو اجیر کہہ کر خطاب کیا جاتا اور وہ اس پر کسی طرح کا عتاب نہ کرتا، چناں چہ ابو مسلم خولانی کے بارے میں آتا ہے کہ وہ حضرت معاویہؓ کے پاس گئے اور یوں سلام کیا: السلام علیك أیها الأجیر! اے اجیر آپ پر سلامتی ہو، جو لوگ وہاں بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے کہا کہ یوں کہو: السلام علیك أیها الأمیر! اے امیر آپ پر سلامتی ہو، انھوں نے پھر کہا: السلام علیك أیها الأجیر! اے اجیر آپ پر سلامتی ہو، لوگوں نے پھر ٹوکا، تین مرتبہ ایسا ہی ہوا، تب حضرت معاویہؓ نے فرمایا: ابو مسلم کو چھوڑ دو، وہ جو کچھ کہہ رہے اس کے مفہوم سے وہ بخوبی واقف ہیں۔ (أبو نعیم فی الحلیة: ج: ۲، ص: ۱۲۶)۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ جب خلیفہ بنے تو انھوں نے انسانی مساوات کا یہ سبق دہرایا اور یہ خوبصورت جملے ارشاد فرمائے:

ألا انی لست بخیرکم، ولکنی رجل منکم غیر أن الله جعلنی أثقلکم حملا۔ (الطبقات

الکبری، ج: ۵، ص: ۳۴۰)

سنو! میں تم سے بہتر نہیں ہوں، میں تو تم میں کا ہی ایک آدمی ہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ اللہ نے میرے کاندھوں پر ذمہ داریوں کا بار ڈال دیا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے یہ جملے بتاتے ہیں کہ عہدہ ومنصب اور حکومت وسلطنت کا حصول نہ فضیلت کا معیار ہے اور نہ برتری کی دلیل، حاکم ومنصب دار عام رعایا کی طرح ایک انسان ہوا کرتا ہے۔ مسلمانوں نے انسانی مساوات کا یہ پیغام شاہوں کے ایوانوں میں بھی سنایا؛ چناں چہ حضرت معاذؓ نے ہرقل کے ترجمان سے کہا تھا:

اگر تمہارا بادشاہ ہرقل ہے تو ہمارا بادشاہ اللہ ہے جس نے ہمیں پیدا کیا، ہمارا امیر ہم میں کا ہی ایک آدمی ہوتا ہے، اگر وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرے تو ٹھیک ورنہ ہم اسے معزول کردیں، وہ نہ ہم سے چھپتا ہے اور نہ ہم پر اکڑتا ہے اور نہ ہی اللہ کی دی ہوئی عطا میں غیر مستحق کو ترجیح دیتا ہے، وہ تو ہماری ہی طرح ایک آدمی ہے۔ (فتوح الشام للأزدی:۱۰۴)

حضرت ربعی بن عامرؓ نے رستم کے دربار میں بلا خوف وخطر یہ اعلان کیا تھا کہ اللہ نے ہمیں بھیجا ہے؛ تاکہ ہم بندوں کو بندوں کی غلامی سے نکال کر ایک اللہ کی غلامی کی طرف لے کر آئیں۔

زمانہ جاہلیت میں عربوں کو اپنے عرب ہونے پر اتنا ناز تھا کہ وہ عجمیوں کو کسی شمار میں نہیں لاتے تھے، علاقہ جاتی تعصب کے نشہ میں وہ مخمور تھے، مگر آپ ﷺ کی تعلیمات کی وجہ سے مسلم سماج انسانی مساوات کا ایسا نمونہ بنا کہ عربوں نے عجمیوں کی صلاحیت وصالحیت کا نہ صرف اعتراف کیا بل کہ انھیں عزت واحترام کا وہ مقام دیا جس کے وہ مستحق تھے؛ چناں چہ حضرت امام بخاری کو امیر المومنین فی الحدیث کے خطاب سے نواز اور امام غزالی کو حجۃ الاسلام کے لقب سے سرفراز کیا، یہ دو نام تو بہ طور مثال ذکر کردیے ورنہ فقہا ومحدثین کی ایک لمبی فہرست ہے جنھیں عربوں نے سر آنکھوں پر بٹھایا اور دل کے نہاں خانوں میں بسایا۔

دنیا کے مختلف سماج میں پیشوں اور صنعتوں کی بنیاد پر انسانوں کے درمیان تفریق کی جاتی ہے اور برتر وکم تر کی درجہ بندی کی جاتی ہے، بھارت میں تو ذات پات کا پورا فلسفہ ہی اس کے گرد گھومتا ہے۔ مسلم سماج میں ہمیں علما کی ایک بڑی تعداد مختلف پیشوں کی طرف منسوب نظر آتی ہے، اور بعض علما کی نسبت تو ایسے پیشوں کی طرف ملتی ہے جنھیں بھارتی سماج میں حقارت آمیز پیشہ سمجھا جاتا ہے، مختلف پیشوں سے منسلک یا مختلف پیشوں کی طرف منسوب علما کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس کے لیے مستقل کتاب درکار ہے، بہ طور مثال یہاں چند نسبتیں ذکر کی جاتی ہیں: صابونی (صابون ساز یا صابون فروش)، حصاص (چونا بنانے یا بیچنے والا)، خصاف (موچی)، حداد (لوہار)، نجار (بڑھئی)، اسکاف (موچی)، بقالی (سبزی فروش)، دباس (شیرہ فروش)، بزاز (پارچہ فروش)، جزار (قصاب)، فراء (پوستین ساز یا پوستین فروش)، وغیرہ۔ مختلف پیشوں کی طرف منسوب علما کا مسلم سماج میں موجود ہونا؛ اور نہ صرف یہ کہ موجود ہونا بل کہ اپنے علم وتقوی کی وجہ سے عزت واحترام کے بلند تر مقام پر فائز ہونا اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ مسلم سماج میں پیشوں کی بنیاد پر نہ کسی کو افضل سمجھنے کی گنجائش ہے اور نہ کسی کو ابتر۔ فضیلت کا معیار پیشہ نہیں بل کہ تقوی ہے۔ اگر کہیں مسلم سماج میں پیشوں کو افضلیت کا معیار سمجھا جاتا ہے تو وہ اسلام کا نہیں جاہلیت کا نمائندہ سماج ہے۔

ہمارے ملک میں بھارت میں جب اسلام آیا تو اس نے ایک ایسا سماج تشکیل دیا جو ذات پات کی لعنت سے پاک اور انسانی بنیادوں پر استوار تھا، مسلمانوں کی اس سماجی زندگی کا اثر اس ملک کے غیر مسلموں پر پڑا، مسلم سماج میں پائی جانے والی انسانی مساوات اور مسلمانوں کا شودروں اور اچھوتوں کے ساتھ کیا جانے والا مساویانہ سلوک اس ملک میں اسلام کی اشاعت کا ایک بڑا اور غالبا سب سے سبب بنا، بھارت کے سماج پر اسلام کے پیغام اخوت ومساوات کا جو اثر پڑا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے جواہر لعل نہرو لکھتے ہیں:

THe idea of the brotherhood of Islam and of the theoritical equality of its adherents made a powerful appeal, especially to those in the Hindu fold who where denied any semblance of equal treament. ... Many conversions took place. (The discovery of India: 265)

اسلام کے اخوت کے نظریے اور مسلمانوں کی نظریاتی مساوات نے ہندوؤں کے ذہن پر بہت گہرا اثر ڈالا، خصوصا وہ لوگ جو ہندو سماج میں برابری حقوق سے محروم تھے اس سے بہت متاثر ہوئے،۔۔۔ بہت سے لوگوں نے اسلام قبول بھی کیا۔

ہمارے نبی ﷺ نے انسانی مساوات، اخوت اور سماجی انصاف کی جو تعلیم دی تھی آج دنیا اس کی پیاسی ہے، رنگ ونسل کا امتیاز، ذات پات کی لعنت اور عرب وعجم کا تعصب نوع انساں کے لیے ناسور ہے، مسلم قوم بھی اس سے مستثنی نہیں ہے، یہ قوم بھی اپنے گھٹیا مفادات کی خاطر امتیاز رنگ وخوں کی خوگر اور بتان شعوب وقبائل کی پرستار بن چکی ہے، عرب وترک کے امتیاز نے خلافت عثمانیہ کی بخیہ ادھیڑی تھی اور اس امتیاز وتعصب کی بنیادیں اتنی گہری ہیں کہ ایک صدی ہونے کو آرہی ہے مگر عرب وترک کے پیرہن کا چاک ابھی بھی تشنۂ رفو ہے، عرب وترک جانے کی کیا ضرورت ہے؟ خود بھارت کہ جہاں مسلمان انسانی مساوات کا تحفہ لے کر آئے وہاں کے مسلمانوں کا آج یہ حال ہے کہ فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں، یہاں کے مسلمانوں میں مختلف نوعیتوں کا تعصب پایا جاتا ہے، مسلکی تعصب، علاقائی تعصب، ادارہ جاتی تعصب وغیرہ وغیرہ، ان سب کے ساتھ ذات پات کی لعنت مستزاد، جس قوم کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ذات پات کی لعنت سے اس سرزمین کو پاک کرے، وہ قوم خود ذات پات کی لعنت میں مبتلا ہے، بھارت میں رائج ذات پات کا سب سے وسیع اور گہرا مطالعہ ڈاکٹر امبیڈکر نے کیا ہے، انھوں نہ صرف یہ کہ ذات پات کے خاتمہ کے لیے علمی کاوشیں کیں؛ بل کہ اپنی عملی زندگی بھی اسی مقصد کے لیے وقف کردی، ہمیں ان کے بعض نظریات سے بہت سخت اختلاف ہے؛ لیکن ان کا یہ تجزیہ مبنی بر حقیقت ہے کہ اسلام نے ذات اور نسل کی تفریق کو ختم کیا مگر بھارتی مسلمانوں سے ذات پات کی لعنت ختم نہ ہوسکی، وہ کہتے ہیں :

Although Islam is the one religion which can transcend race and colour and unite diverse people into a compact brotherhood, yet

Islam in India has not succeeded in uprooting caste from among the Indian Musalmans. Caste feeling among the Musalmans is not so virulent as it is among the Hindus. But the fact is that, it exists. DR. BABASAHEB AMBEDKAR : WRITINGS AND SPEECHES. V: 5, P: (245

گوکہ اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو رنگ ونسل کے امتیازات مٹا کر متنوع لوگوں کو اخوت کی لڑی میں پرونے کی صلاحیت رکھتا ہے؛ مگر اس کے باوجود بھارت میں اسلام بھارتی مسلمانوں کے درمیان سے ذات پات کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہیں ہوا، ذات پات کا احساس مسلمانوں کے درمیان ہندووں جیسا شدید تو نہیں ہے مگر پھر بھی ہے، حقیقت یہی ہے۔

ضرورت ہے کہ مسلم قوم اپنے اندر سے رنگ وخوں، ذات ونسل اور علاقہ وادارہ کے امتیازات کو دور کرے اور اپنے نبی کا پیغام اخوت ومساوات لے کر اٹھے تاکہ دنیا میں وہ سماج تشکیل پاسکے جس کی بنیاد اخوت ومساوات پر ہو:

یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوّت کی جہاں گیری، محبّت کی فراوانی
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوّت کا بیاں ہو جا، محبّت کی زباں ہو جا

کنور ندیم مبارکپوری، اعظم گڑھ

غزل

کیوں یہ لگتا ہے مجھے آج بلاتا ہے کوئی
دل کی دہلیز پہ آواز لگاتا ہے کوئی

ڈال کر عکس طلب چاند کی پیشانی میں
رات بھر مجھ کو کھلی چھت پہ جگاتا ہے کوئی

دل کے ویران خرابے میں امیدوں کی طرح
اک دیا روز جلاتا ہے بجھاتا ہے کوئی

توڑ کر شیشہء دل اور مٹا کر مجھ کو
مری تصویر پہ کیوں اشک بہاتا ہے کوئی

بیٹھ جاتا ہے کوئی پاؤں کی بیڑی بن کر
اور مرے واسطے پلکوں کو بچھاتا ہے کوئی

مری خواہش کو سدا قتل کوئی کرتا ہے
مرے ارمان کی ارتھی بھی اٹھاتا ہے کوئی

جانے کس موڑ پہ ہم لوگ چلے آئے ندیم
کوئی دیتا ہے دوا درد بڑھاتا ہے کوئی

ڈاکٹر صالحہ صدیقی۔ حیدرآباد

جاتے ہوئے وہ سب کو رلاتا چلا گیا

مدھیہ پردیش کے اندور کا رہنے والا ایک عوامی شاعر جس کی شاعری عوام کے دل کی دھڑکنوں کی ترجمان، گردو پیش کی غماز، لوگوں کے دلوں کو جوش وخروش سے بھر دینے والی آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرن بننے والا شاعر ہم سب کو اداس کر کے چلا گیا۔

راحت اندوری (پیدائش: 1 جنوری 1950ء)
ایک بھارتی اردو شاعر اور ہندی فلموں کے نغمہ نگار تھے . وہ دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور میں اردو ادب کے پروفیسر بھی رہ چکے تھے۔ وہ کئی بھارتی ٹیلی ویژن شوز کا بھی حصہ رہ چکے تھے۔ انہوں نے کئی گلوکاری کے ریلیٹی شوز میں بہ طور جج حصہ لیا۔ انہوں نے نئی نسل کو کئی رہنمایانہ باتیں بتائی جو ان کے فنی سفر، تلفظ اور گلوکاری میں معاون ثابت ہوئے۔

راحت اندوری کی پیدائش اندور میں یکم جنوری، 1950ء کو ہوئی۔ وہ ایک ٹیکسٹائل مل کے ملازم رفعت اللہ قریشی اور مقبول النساء بیگم کے یہاں پیدا ہوئے . وہ ان کی چوتھی اولاد تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم نوتن اسکول اندور میں ہوئی. انہوں نے اسلامیہ کریمیہ کالج اندور سے 1973ء میں اپنی بیچلر کی تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد وہ 1975ء میں راحت اندوری نے برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ اعلیٰ ترین تعلیمی سند کے لیے 1985ء میں انہوں نے مدھیہ پردیش کے مدھیہ پردیش بھوج اوپن یونیورسٹی سے اردو ادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی . وہ ایک اچھے شاعر اور گیت کار ثابت ہوئے، مشاعروں کی دھڑکن بنے۔

انہوں نے کئی بالی وڈ فلموں کے لیے نغمے لکھے، جو مقبول اور زبان زد عام بھی ہوئے ہیں۔ جن میں کوئی جائے تو لے آئے'، عشق فلم کا 'نیند چرائی میری' کے علاوہ منا بھائی ایم بی بی ایس جیسی مشہور فلم کا گانا 'ایم بولے تو منا بھائی' بھی شامل ہیں۔

ان کی وفات پر پورا ہندستان غمزدہ نظر آیا اور اپنی کیفیات کا اظہار ٹویٹ کے ذریعہ کیا جن میں راہل گاندھی، اروند کیجریوال، راج ناتھ سنگھ، اکھیلیش یادو جیسی ممتاز شخصیات شامل ہیں۔ انڈین ریاست مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ شیوراج سنگھ چوہان نے ٹویٹ کر کے کہا کہ اپنی شاعری سے لاکھوں کروڑوں دلوں پر راج کرنے والے مشہور شاعر اور ہر دل عزیز راحت اندوری کا انتقال مدھیہ پردیش اور پورے ملک کے لیے کبھی نا پورا ہونے والا نقصان ہے۔ راحت اندوری کے کلام کا یہ نمونہ ملاحظہ فرمائیں , جس میں سماج کی حقیقت کے ساتھ انسانی نفسیات کی بہترین ترجمانی بھی کی گئی ہے۔

دنیا سے قبیلے سے لڑائی لیتے
ایک سچ کے لیے کس کس سے برائی لیتے
آبلے اپنے ہی انگاروں کے تازہ ہیں ابھی
لوگ کیوں آگ ہتھیلی پہ پرائی لیتے
برف کی طرح دسمبر کا سفر ہوتا ہے
ہم اسے ساتھ نہ لیتے تو رضائی لیتے
کتنا مانوس سا ہمدردوں کا یہ درد رہا
عشق کچھ روگ نہیں تھا جو دوائی لیتے
چاند راتوں میں ہمیں ڈستا ہے دن میں سورج

شرم آتی ہے اندھیروں سے کمائی لیتے
تم نے جو توڑ دیے خواب ہم ان کے بدلے
کوئی قیمت کبھی لیتے تو خدائی لیتے

راحت اندوری کی شاعری میں بلا خوف وجھجک کے سماجی برائیوں کی عکاسی دیکھی جاسکتی ہے۔ان کا دل ظلم وستم اور زیادتی سے کھوکھلے ہورہے نظام سے بے چین ہواٹھتا تھا اور وہ ان برائیوں کے خلاف بے باک دہل محفلوں میں بول اٹھتے تھے۔عوام اپنے مسائل کو محفل میں اٹھتا دیکھ جھوم اٹھتے اور تالیاں کی گونج سے ماحول جھوم اٹھتا۔ شاعری بھلے ہی وہ مشاعروں کے لیے کرتے لیکن ان کے موضوعات ہمیشہ عوامی ہوتے۔یہی وجہ تھی کہ سیاست داں ان سے بھاگتے،ان کو لال قلعے کے مشاعرے میں اسی لیے نہیں پڑھنے دیا گیا۔ کیونکہ وہ خوشامد کرنے والے شاعر نہیں تھے بلکہ سچے ہندستانی شاعر تھے، جو اپنی بات بلاخوف کہنا جانتے تھے۔وہ ہندستان کے ہر گھر کو اپنا گھر اور ہر ہندستانی کو اپنا بھائی سمجھتے تھے ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جس میں ان کے بھائی چارگی اور محبت کے اسی جذبے کو دیکھا جاسکتا ہے:

کبھی دماغ کبھی دل کبھی نظر میں رہو
یہ سب تمہارے ہی گھر ہیں کسی بھی گھر میں رہو
جلا نہ لو کہیں ہمدردیوں میں اپنا وجود
گلی میں آگ لگی ہو تو اپنے گھر میں رہو
تمہیں پتہ یہ چلے گھر کی راحتیں کیا ہیں
ہماری طرح اگر چار دن سفر میں رہو
ہے اب یہ حال کہ در در بھٹکتے پھرتے ہیں
غموں سے میں نے کہا تھا کہ میرے گھر میں رہو
کسی کو زخم دیے ہیں کسی کو پھول دیے
بری ہو چاہے بھلی ہو مگر خبر میں رہو

راحت اندوری کہنے کو مشاعروں کے شاعر تھے، لیکن ان کی شاعری میں ادبی نقوش جا بجا ملتے ہیں، ان کی شاعری میں زندگی کے ہر عام وخاص موضوع کو موضوع سخن بنایا گیا۔ انسانی نفسیات ہو یا غریبوں کے مسائل غرض کہ سماجی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، نظامی، کلچرل زندگی سے متعلق تمام گوشوں پر انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے اظہار خیال کیا۔ ان کی زبان صاف ستھری اور معنی خیز ہونے کے ساتھ ان کے انداز بیاں سے ایک نئی جان پیدا ہوجاتی تھی۔ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو مشاعروں کی جان بنا:

کام سب غیر ضروری ہیں جو سب کرتے ہیں
اور ہم کچھ نہیں کرتے ہیں غضب کرتے ہیں
آپ کی نظروں میں سورج کی ہے جتنی عظمت
ہم چراغوں کا بھی اتنا ہی ادب کرتے ہیں
ہم پہ حاکم کا کوئی حکم نہیں چلتا ہے
ہم قلندر ہیں شہنشاہ لقب کرتے ہیں
دیکھیے جس کو اسے دھن ہے مسیحائی کی
آج کل شہر کے بیمار مطب کرتے ہیں
خود کو پتھر سا بنا رکھا ہے کچھ لوگوں نے
بول سکتے ہیں مگر بات ہی کب کرتے ہیں
ایک اک پل کو کتابوں کی طرح پڑھنے لگے
عمر بھر جو نہ کیا ہم نے وہ اب کرتے ہیں

راحت اندوری کی مسائلی شاعری کے آگے بشیر بدر کی سبک رومانی شاعری بھی بجھی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔حالانکہ دونوں کا میدان الگ ہے۔ راحت اندوری کے نرالے اندازِ بیان سے لوگ جھوم جھوم اٹھتے تھے۔لوگ محفلوں میں ان کی شاعری کے سیاسی اشاروں کنایوں سے لطف اندوز ہوتے جو ان کی شاعری کا اہم وصف بھی بن گیا۔ان اشعار کا مزہ لیجیے

جن میں سیاسی چھبن محسوس ہوتی ہے۔جس نے ان کی مشاعروں میں الگ شناخت قائم کی۔

اب کہاں ڈھونڈنے جاوگے ہمارے قاتل
آج تو قتل کا الزام ہمیں پر رکھ دو
شاخوں سے ٹوٹ جائیں وہ پتے نہیں ہیں ہم
آندھی سے کوئی کہہ دے کہ اوقات میں رہے
شہروں میں تو بارو دوں کا موسم ہے
گاوں چلو یہ امرو دوں کا موسم ہے
ہم اپنے بوڑھے چراغوں پہ خوب اترائیں
اور اس کو بھول گئے جو ہوا چلا تا ہے

یہ اور اس طرح کے بہت سے اشعار میں طنز کی تیز دھار پائی جاتی ہے۔وہ ایک سنجیدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ نوجوان نسل کی نبض تھامنا خوب جانتے تھے۔اس کی ایک مثال ہے ان کی نظم 'بلاتی ہے مگر جانے کا نہیں' جو سوشل میڈیا پر وائرل ہوگئی تھی۔جس پر نوجوانوں نے سوشل میڈیا پر خوب ویڈیوز بنائی۔ٹک ٹاک پر ہزاروں ویڈیو بنائی گئی۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

بلاتی ہے مگر جانے کا نہیں
یہ دنیا ہے ادھر جانے کا نہیں
میرے بیٹے کسی سے عشق کر
مگر حد سے گزر جانے کا نہیں
ستارے نوچ کر لے جاوں گا
میں خالی ہاتھ گھر جانے کا نہیں
وہ گردن ناپتا ہے ناپ لے
مگر ظالم سے ڈر جانے کا نہیں

مشاعروں کی جان اندوری صاحب کو لوگ ہمہ تن گوش ہوکر سماعت کرتے اور ان کے سحر میں ایسے گرویدہ ہوتے کہ وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ان کے لب و لہجہ میں بلا کی کشش تھی۔ان کی شاعری دلوں میں براہ راست اترتی چلی جاتی تھی۔ان کا انوکھا انداز بیاں ہر کسی کو اپنا دیوانہ بنا دیتا۔ایک ایک لفظ گنگا کے پانی کی طرح صاف و شفاف ہوتا تھا۔وہ عوامی شاعری کرتے تھے اور عوام کے مسائل کو پیش کرتے تھے۔ان کا کوئی لفظ بھی ثقیل اور نا قابل فہم نہیں ہوتا۔ بلکہ سننے والے کے دل میں اترتا چلا جاتا۔ان کو اظہار پر کامل قدرت تھی۔وہ دلی جذبات و احساسات کو شعری سانچے میں ڈھال دیتے تھے جس کے سبب وہ عام و خاص دونوں کے شاعر تھے۔یہ کمال یہ ہنر انہیں کا حصہ تھا جو ان کے ساتھ چلا گیا۔وہ ایک ایسے شاعر تھے جو ہندی کے کوی سملین میں بھی اردو کا جادو جگا دیتے تھے۔یہی سبب ہے کہ ہندی والے بھی انہیں ٹوٹ کر پیار کرتے ہیں۔ان کی شاعری سے حذ لیتے ہیں۔ان کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

جب کبھی پھولوں نے خوشبو کی تجارت کی ہے
پتی پتی نے ہواؤں سے شکایت کی ہے
یوں لگا جیسے کوئی عطر فضا میں گھل جائے
جب کسی بچے نے قرآں کی تلاوت کی ہے
جا نمازوں کی طرح نور میں اجلائی سحر
رات بھر جیسے فرشتوں نے عبادت کی ہے
سر اٹھائے تھیں بہت سرخ ہوا میں پھر بھی
ہم نے پلکوں کے چراغوں کی حفاظت کی ہے
مجھے طوفان حوادث سے ڈرانے والو
حادثوں نے تو مرے ہاتھ پہ بیعت کی ہے
آج اک دان؟ گندم کے بھی حق دار نہیں
ہم نے صدیوں انہیں کھیتوں پہ حکومت کی ہے
یہ ضروری تھا کہ ہم دیکھتے قلعوں کے جلال

عمر بھر ہم نے مزاروں کی زیارت کی ہے

وہ قومی یکجہتی کے علمبردار ہیں۔ان کا شعری مجموعہ کلام اچھی شاعری کا مرقع ہے۔اس میں صرف غزلیں ہیں۔مجروح کی طرح راحت بھی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔آیئے ان کی رومانی شاعری سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

میل کے پتھروں سے پوچھتا ہوں
اپنے اک ہم سفر کے بارے میں
سارے منظر گورے گورے لگتے تھے
جانے کس کا روپ نظر میں رہتا تھا
یہ ملاقات آخری تو نہیں
ہم جدائی کے ڈر سے پوچھتے ہیں
وہ گزرتا تو ہو گا اب تنہا
اک اک رہگزر سے پوچھتے ہیں
عشق ازل ہے عشق ابد ہے
عشق کوئی تحریک نہیں ہے
شام سے پہلے شام کر دی ہے
کیا کہانی تمام کر دی ہے

مذکورہ اشعار میں نیا پن ہے۔دل کو چھو لینے والی بات ہے۔خیال کا بہاؤ ہے۔جذبات کا وفور ہے۔نئے تجربے ہیں۔نئی پگڈنڈیاں ہیں۔

راحت اندوری نے شاعری کے امکانات کو روشن کر دیا ہے۔پرانی ڈگر کو خیر باد کہتے ہوئے غزل میں تازگی پیدا کی ہے۔غزل کے پھول کو مرجھانے سے بچا لیا ہے۔یہ ان کی کامیابی کی دلیل ہے۔ان کے شعروں کو سمجھنے کے لئے ذہن پر زیادہ بار ڈالنے کی ضرورت لاحق نہیں ہوتی۔ان کی تخلیق لفظوں کا گورکھ دھندا نہیں۔اس میں معنویت ہوتی ہے۔ان کی شاعری کا سب سے بڑا وصف طنز کا نشتر ہے۔

مسجد خالی خالی ہے
بستی میں قوالی ہے
عبادتوں کا تحفظ بھی ان کے ذمہ ہے
جو مسجدوں میں سفاری پہن کے آتے ہیں
سب کو باری باری رسوا کیا کرو
ہر موسم میں فتوئے جاری کیا کرو
اب سے پہلے کے جو قاتل تھے بہت اچھے تھے
قتل سے پہلے وہ پانی تو پلا دیتے تھے
دولت بازو حکمت گیسو شہرت ماتھا غیبت ہونٹ
اس عورت سے بچ کر رہنا یہ عورت بازاری ہے

اسی طرح سماجی حقائق کی ترجمانی کرتا ان کے یہ اشعار بھی ملاحظہ فرمائیں:

چراغوں کو اچھالا جا رہا ہے
چراغوں کو اچھالا جا رہا ہے
ہوا پر رعب ڈالا جا رہا ہے
نہ ہار اپنی نہ اپنی جیت ہوگی
مگر سکہ اچھالا جا رہا ہے
وہ دیکھو مے کدے کے راستے میں
کوئی اللہ والا جا رہا ہے
تھے پہلے ہی کئی سانپ آستیں میں
اب اک بچھو بھی پالا جا رہا ہے
مرے جھوٹے گلاسوں کی چھکا کر
بہکتوں کو سنبھالا جا رہا ہے
ہمی بنیاد کا پتھر ہیں لیکن
ہمیں گھر سے نکالا جا رہا ہے
جنازے پر مرے لکھ دینا یارو
محبت کرنے والا جا رہا ہے

راحت اندوری نے اپنی تخلیقی سوچ سے شاعری کے کینوس کو وسیع تر کر دیا ہے۔ نت نئے خیالات کے بیل بوٹے کھلائے ہیں۔ دنیائے سخن کو مالا مال کر دیا ہے۔ نئی نسل کو جدت طرازی کی جانب مائل کیا ہے۔ راحت اندوری نے اپنی انفرادیت کے گہرے نقوش شاعری پر مرتب کئے ہیں۔

ندی نے دھوپ سے کیا کہہ دیا روانی میں
اجالے پاؤں پٹکنے لگے ہیں پانی میں
یہ کوئی اور ہی کردار ہے تمہاری طرح
تمہارا ذکر نہیں ہے مری کہانی میں
اب اتنی ساری شبوں کا حساب کون رکھے
بڑے ثواب کمائے گئے جوانی میں
چمکتا رہتا ہے سورج مکھی میں کوئی اور
مہک رہا ہے کوئی اور رات رانی میں
یہ موج موج نئی ہلچلیں سی کیسی ہیں
یہ کس نے پاؤں اتارے اداس پانی میں
میں سوچتا ہوں کوئی اور کاروبار کروں
کتاب کون خریدے گا اس گرانی میں

وہ آج ہمیں بھلے ہی چھوڑ چلے گئے، لیکن انھیں ادبی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مشاعروں کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی، راحت اندوری کو سرفہرست رکھا جائے گا۔ انھوں نے ساری عالمی برادری میں ہندوستان کا نام روشن کیا ہے۔ اردو کی اجنبی بستیوں میں ان کی شخصیت اور آواز کا سحر دیکھا جاسکتا ہے۔ وہ ہزاروں لاکھوں انسانوں کا محبوب شاعر ہے۔ انھیں دیکھنے اور سننے کے لئے مجمع منتظر رہتا تھا۔

راحت اندوری عصری چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرتے تھے۔ شعور وادراک کے چراغ جلاتے۔ ان کا تخاطب تیکھا ہوتا تھا۔ وہ خفتہ ضمیر انسانی کو جھنجوڑتے۔ سماج کو آئینہ دکھاتے۔ ان کی پرواز تخیل لامکاں ہوتی تھی۔ وہ عزم وحوصلہ کے امین بن جاتے تھے۔ ان کی شاعری تعفن طبع کے لئے نہیں زمانے کو پہچاننے کے لئے ہوتی ہے۔ وہ ناصح بن کر نہیں دوست بن کر بات کرتے۔ ان کے خلوص اور دردمندی کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ وہ غم کے اندھیرے میں ہمت کا اجالا بانٹتے تھے۔ ان کی زنبیل میں دکھوں کا مداوا اور نسخہ کیمیا موجود ہیں۔

سوال گھر نہیں بنیاد پر اٹھایا ہے
سوال گھر نہیں بنیاد پر اٹھایا ہے
ہمارے پاؤں کی مٹی نے سر اٹھایا ہے
ہمیشہ سر پہ رہی اک چٹان رشتوں کی
یہ بوجھ وہ ہے جسے عمر بھر اٹھایا ہے
مری غلیل کے پتھر کا کارنامہ تھا
مگر یہ کون ہے جس نے ثمر اٹھایا ہے
یہی زمیں میں دبائے گا ایک دن ہم کو
یہ آسمان جسے دوش پر اٹھایا ہے
بلندیوں کو پتہ چل گیا کہ پھر میں نے
ہوا کا ٹوٹا ہوا ایک پر اٹھایا ہے
مہابلی سے بغاوت بہت ضروری ہے
قدم یہ ہم نے سمجھ سوچ کر اٹھایا ہے

آج بھلے ہی وہ ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن اپنی تحریروں سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔۔۔ آج کا دن اردو شاعری کی تاریخ کا واقعی خسارے کا دن ہے۔۔۔ آج ان کا یہ شعر بھی یاد آرہا ہے کہ:

دو گز سہی مگر یہ مری ملکیت تو ہے
اے موت! تو نے مجھ کو زمیندار کر دیا

سیدہ زہرا جبین۔حیدرآباد

تقدیر میں ہوتو...

دوسرے دن جب وہ پڑھائی کررہے تھے وہ بار بار فون چیک کرنے لگی۔

"یہ تو بار بار اپنے موبائل میں کیا دیکھ رہی ہے؟" عروج نے اس کی یہ حرکت نوٹس کی تھی۔

" کچھ نہیں وقت دیکھ رہی ہوں، بڑی نیند آرہی ہے آج۔اس نے نظریں چرائی۔

" آج عروج نہیں ہے میں خود ہی کال کرلیتی ہوں" رات کے گیارہ بج رہے تھے فون رنگ ہوتا رہا پر دانش نے ریسیو نہیں کیا، اس کے بدلے ایک میسج کیا۔

" کچھ دیر روکو میں خود ہی کال کرونگا"۔

"ہوں! میں کونسا مری جارہی ہوں" . وہ چڑھ گئی۔

کچھ دیر بعد اس نے فون کیا۔

'' کدھر تھے تم؟ آج پورے تین دن ہوئے تمہارے فون کا انتظار کرتے ہوئے ... اگر تم بزی تھے تو میں کون سا فارغ تھی" دانش نے 'ہیلو' کہا ہی تھا وہ لڑا کا عورتوں کی طرح اس پر برس پڑی۔

" اچھا سنو ...ہیپی ویلینٹاین ڈے" لہجہ مدھم تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے اور چودہ فروری کا دن شروع ہو چکا تھا۔

"ہاہاہا! بس کرو اب" سنایا ہنسنے لگی۔

"میں کوئی لطیفہ سنا رہا ہوں جو ہنس رہی ہو؟ سیم ٹو یو تو بولو". انداز رعاب دار تھا۔

"اچھا سیم ٹو یو". عجیب شخص ہے وہ سوچنے لگی۔

"تم نے مجھے وش کیا اس کا مطلب ہے کہ تم مجھ میں انٹرسٹڈ ہو". وہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔سنایا الجھ گئی۔

"ارے تم نے ہی تو زبردستی کہلوایا ہے"۔

"میں جو بولوں کروگی؟" وہ ہنسی دباتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"لیکن میں"... وہ اور الجھ گئی۔

"میری بات غور سے سنو! میں نے جان بوجھ کر تم کو کال نہیں کیا تھا یہ دیکھنے کے لئے کی تم کیسے ریکٹ کروگی، تم عین میری توقع کے مطابق مجھ سے ناراض ہوگی، اگر میں تم سے بات نہ کروں تو تم بے چین ہوجاتی ہو ایسا ہی کچھ میرا بھی حال ہے .... سنایا تم مجھے بہت پسند ہو". اس نے اپنا دل سنایا کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

"لیکن ہم تو کبھی ملے بھی نہیں". وہ الجھ رہی تھی۔

"محبت صرف ملنے سے نہیں ہوتی، میری پڑھائی ختم ہوتے ہی میں اپنے گھر والوں سے کہہ دونگا کیونکہ میں ماما کے بعد مجھے ڈانٹنے کا حق اپنی بیوی کو دینا چاہتا ہوں، کیا تم یہ حق قبول کروگی؟" وہ بہت ہی آرام سے کہہ رہا تھا اور سنایا چپ چاپ اس کی سنے جارہی تھی۔

"میں جانتا ہوں تم بھی مجھے پسند کرتی ہو". وہ اس کے دل کی کیفیت خود اس سے بھی زیادہ جانتا تھا". تم بس ڈرنا بند کرو، آدھے مسئلے حل ہوجائینگے". اس کے مزید چپ رہنے پر دانش نے کہا۔

"اور کوئی حکم؟" وہ چڑھ گئی۔

"ابھی تو اتنا ہی کافی ہے اور ہاں میری باتوں پر غور

کرنا ... خدا حافظ". اس نے ہنستے ہوئے کہا اور کال کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

فون بند ہوتے ہی سنایا کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، اس نے پڑھائی کا ارادہ ملتوی کیا اور اس کی باتوں میں کھو گئی۔

"ہونہ! یہ کون سا طریقہ ہے پرپوز کرنے کا؟"

جب عروج کو پتا چلا تو اسے دانش کا انداز ناگوار گزرا۔

"ارے ناراض کیوں ہوتی ہو؟ وہ بہت اچھا ہے".

سنایا کے لب پھر مسکرا اٹھے۔

"مجھے تیرے تیور کچھ بدلے بدلے سے لگ رہے ہیں" وہ اسے جانچتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

"عادت ہوگی ہے اس سے بات کرنے کی ... بہت اچھا لگتا ہے اور ... مجھے ... محبت ہوگئی ہے اس سے". وہ بیساختہ مسکراتے ہوئے کہنے لگی۔

"اگر ایسا ہے تو میں دعا کرتی ہوں کہ اسے بھی تم سے سچی محبت ہو". اسے اب بھی کچھ خدشات نظر آرہے تھے۔

اس کا ایم۔ایس۔سی کا رزلٹ آگیا۔ وہ سیکنڈ ڈویژن سے پاس ہوئی تھی جب کہ عروج فرسٹ ڈویژن سے پاس ہوئی تھی۔

سنایا نے دانش کو فون کیا۔

"دیکھا میری صحبت کا اثر کس آسانی سے پاس ہوگئی تم". اس نے اسے چھیڑا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری، میں تو ہمیشہ ہی فرسٹ آتی تھی، صرف تمہاری وجہ سے سیکنڈ آئی ہوں"۔

"میں کیا پڑھنے سے روکتا تھا؟"

"اور نہیں تو کیا ہر وقت تمہارا ہی تو خیال"... سنایا نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

"تم فضول باتیں بہت کرتی ہو اور جو بولنا ہوتا ہے وہ نہیں بولتی". دانش نے آہ بھری اور ادھر وہ کھل کھلا کر ہنسنے لگی۔

"اچھا اچھا اب دانت مت نکالو، میرے صرف دو امتحان رہتے ہیں، دعا کرنا کہ میری فرسٹ پوزیشن آئے، تمہاری صحبت کا اثر نہ ہو". آخری جملہ بہت دھیرے کہا تھا۔

"ضرور دعا کرونگی". پر جب بات سمجھ میں آئی تو چیخ اٹھی "کیا کہا تم نے"...

"مذاق کر رہا تھا یار، امتحان سے فارغ ہوتے ہی میں حیدرآباد آجاؤنگا". اس کی ہنسی نکل گئی۔

نور حسن صاحب کے دوست کے لڑکی کی شادی کا کارڈ آگیا۔ ثانیہ اور سنایا دونوں کو ہی شادیوں میں جانے کا بہت شوق تھا، ایک تو چھٹیاں تھیں تو دونوں نے ممی کے کسی روک ٹوک کے بغیر سارے ہی فنکشن خوب انجوائے کیے، شادی کے ہنگامے ختم ہوئے تو وہ گھر کے کام کاج میں جٹ گئی۔

ایک دن وہ کچھ کام میں مصروف تھی کی ثانیہ بھاگتی ہوئی آکر بتانے لگی کی باقر انکل کے کسی دوست کے لڑکے کا رشتہ آیا ہے اس کے لئے۔

"سچ کہہ رہی ہوں ابھی ابھی میں نے ممی کو فون پر چاچی سے کہتے سنا ہے". وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہہ رہی تھی، وہ کچھ دیر رکی اور پھر کہنے لگی" . ہم شادی میں گئے تھے نا، وہیں پسند کیا تھا ان لوگوں نے آپ کو ... اب دیکھنا باجی میں آپ کی شادی کی کتنی تیاری کرونگی". وہ چہک رہی تھی اور ادھر سنایا کی جان نکلی جارہی تھی۔

"ثانیہ میں کام کر رہی ہوں تم جاؤ یہاں سے". اس نے ناگواری سے کہا۔ وہ چلی گئی۔

رات کو جب سب لوگ ٹی۔وی دیکھ رہے تھے، سنایا نے دانش کو فون کیا، وہ ٹھیک سے بات شروع کر بھی نہیں پائی تھی کی ثانیہ آگئی، اس نے جھٹ فون بند کر دیا۔

"آج کوئی ڈرامہ نہیں آرہا کیا؟" سنایا نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"نیند آرہی ہے". وہ بیڈ پر ڈھیر ہوگئی۔

اس نے دانش کو اپنے لئے آنے والے پروپوزل کے بارے میں میسج کردیا، ساتھ میں یہ بھی لکھ دیا کی وہ کچھ دیر بعد کال کریگی، جب وہ مطمئن ہوگئی کی ثانیہ سوگئی ہے تو اس نے بالکونی کا رخ کیا اور دانش کو فون کرنے لگی۔

"مبارک ہو! شادی میں تو بلاؤ گی نا؟" فون ریسیو کرتے ہی دانش نے کہا۔

"میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہو؟" وہ جل کر کہنے لگی۔

"تم کچھ کہنا چاہتی تھی نہ کچھ دیر پہلے، کہو میں سن رہا ہوں". وہ لاپروائی سے بولا۔

"میں بہت پریشان ہوں، اگر گھر والے راضی ہوگئے اس رشتے کے لئے تو کیا کروں؟" اس نے اپنی پریشانی بتائی۔

"مسئلہ کیا ہے؟ کرلو شادی". اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔

"دانش مذاق مت کرو، تم جانتے ہو میں یہ شادی نہیں کرسکتی". وہ چڑھ گئی۔

''میں مزاق نہیں کر رہا اور کیوں نہیں کرسکتی تم شادی؟". وہ کیا سننا چاہتا تھا؟

" کیوں کہ میں تم کو پسند کرتی ہوں۔ یہی سننا چاہتے تھے نا تم؟" اس نے اقرار کیا۔

"دیکھو سنایا کسی کو پسند کرنا اور شادی کرنا دو الگ باتیں ہیں۔ تم وہی کرو جو تمہارے گھر والے چاہتے ہیں". انداز سنجیدہ تھا۔

"میں تمہیں چاہتی ہوں". اس نے پھر ایک بار اپنی محبت کا اقرار کیا۔

"میں سنجیدہ ہوں، بچوں کی طرح ضد مت کرو، اور اپنے گھر والوں کی بات مان لو". وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"دانش! پھر وہ سب کیا تھا جو تم نے پہلے کہا تھا؟" اس کی بے نیازی پر وہ حیران ہی تو ہوئی تھی۔

"میری باتوں کو مزاق سمجھ کر بھول جاؤ۔ بھلائی اسی میں ہے کی تم اپنے گھر والوں کی بات مان لو، اگر تمہیں پتا چلے کہ میں کوئی آوارہ قسم کا لڑکا ہوں تو تب کیا کروگی؟"۔

"میں سدھار لونگی تمہیں". اسے اب بھی کچھ آس تھی۔

"ایسا نہیں ہوسکتا سنایا". اس نے بات ہی ختم کردی تھی جیسے۔

"خدا حافظ دانش احمد". اس نے بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس سلسلے کو ہمیشہ کے لئے ختم کردیا تھا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتی، اتنی ذلت اس نے کبھی نہیں اٹھائی تھی، اتنے ماہ کیا وہ اس کے ساتھ محض وقت گزاری کر رہا تھا؟ وہ جو سچ میں اسے پیار کرنے لگی تھی اور اس کی محبت میں بادلوں کی سیر کر رہی تھی ایک جھٹکے سے زمین پر آ گری۔

بہت مشکل سے اس نے خود کو بیڈ تک ڈھکیلا تھا۔ آنسوں تھے کی تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، کتنی دیر وہ بے آواز روتی رہی، رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگی اسے خود پتا نہ تھا۔

دوسرے دن اسے بخار ہوگیا تھا، سب ہی پریشان تھے، کل تک تو اچھی تھی، عروج بھی ایڈمشن کے لئے پیپرس تیار کرچکی تھی، پھر بھی ایک بار سنایا سے بات کرکے سہمت ہوجانا چاہتی تھی، سو اس نے فون کیا تو سنایا کے بخار کا پتا چلا، وہ فوراً اس سے ملنے چلی آئی۔

اسے دیکھ کر سنایا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اس نے دانش کی کہی ایک ایک بات اسے بتادی۔

"نمبر دے اس کا ابھی طبیعت صاف کرتی ہوں اس

کی، ایسے کیسے کر سکتا ہے وہ؟" عروج کا غصہ اپنی عروج پر تھا، کسی کے قدموں کی آہٹ ہوئی تھی، سنایا نے جلدی سے اپنے آنسوں صاف کیا۔ ثانیہ ناشتہ لئے اندر آ گئی۔

"اب آپ ہی سمجھائیں باجی کو، اب تک ناشتہ نہیں کیا انہوں نے" ثانیہ لوازمات سے سجی ٹرے رکھ کر چلی گئی۔

"نمبر دے اس کا" عروج اپنی بات پر اڑی ہوئی تھی۔

"نہیں عروج ہم کسی سے زبردستی تو نہیں کر سکتے نا، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں، میں نے اپنے دل کی بات کہی، اس نے اپنے دل کی، ضروری نہیں کہ ہمارے دل میں ایک ہی بات ہو، میں نے اسے چاہا، اس نے نہیں چاہا، اس کی مرضی". وہ بیڈ پر آڑھی ترچھی لکیریں ڈال رہی تھی۔

"تم جانتی ہو میرے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ آج مجھے احساس ہوا کی رد ہونے کا احساس کیا ہوتا ہے، شاید اسے بھی ایسی ہی تکلیف ہوئی ہوگی"... وہ اپنی ہی دھن میں تھی۔ آنسوں ایک بار پھر بہنے لگے۔

"سنایا!" عروج تڑپ اٹھی۔

سنایا اور عروج دونوں بچپن کی سہیلیاں تھیں، پڑھائی میں کافی ذہین، سنایا چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہو جاتی تھی ایسے میں عروج ہی ایک واحد دوست تھی جو اسے سمجھتی تھی۔ انٹر میں دونوں نے ہی فرسٹ پوزیشن لی تھیں۔

دونوں کا ایڈمشن عروج کے من پسند کالیج میں ہو گیا۔ وی۔ جی۔ لیس ایجوکیشنل سوسائٹی میں انٹر ڈگری کے اسٹوڈنٹس کو یونیفارم تھا جو سنایا کے لئے ناقابل برداشت تھا، پر عروج بھی اپنے نام کی ایک تھی اسے راضی کروا کر ہی دم لیا، وہاں عروج کے تایازاد نبیلہ اور کاشف پڑھتے تھے، بقول عروج کے اگر اس کالیج میں داخلہ ہوتا ہے تو وہ دونوں کچھ ٹھاٹ سے رہ سکتے ہیں کہ انکی پہنچ سینئرز تک ہے۔

کالیج کے وسیع و عریض گیٹ میں داخل ہوتے ہی اسٹوڈنٹس کا ایک ہجوم نظر آ رہا تھا۔ ایک کے بعد ایک انٹر، ڈگری اور پی۔ جی۔ کے بلاکس تھے، کالیج کا ایک حصے پر مختلف سپورٹس گراؤنڈ تھے جنہیں پار کرنے کے بعد ایک بڑا سا آڈیٹوریم تھا۔

دونوں کو ہی کالیج بہت پسند آیا۔ اب وہ لوگ بی۔ بی۔ اے کے بلاک کی طرف بڑھ گئے۔ بہت تلاش کرنے کے بعد انھیں نبیلہ نظر آ گئی، نبیلہ اور کاشف بی۔ بی۔ اے فائنل ائیر میں تھے۔

"تو کیسا لگا کیمپس.؟" نبیلہ خوش دلی سے ملی۔

"بہت ہی اچھا۔ کل سے جوائن کر رہے ہیں". سنایا خوش ہو کر بولی۔

"چلو ٹھیک ہے، میں ادھر ہی رہتی ہوں کچھ پریشانی ہو تو آ جانا". اس نے مسکرا کر کہا۔

"ہم تو روز ہی آئینگے". عروج کی خوشی دیدنی تھی۔

آے دن وہ بی۔ بی۔ اے بلاک کا چکّر ضرور لگاتے۔ سنایا کاشف سے ایک ہی بار ملی تھی۔ اسے اچھا نہیں لگتا تھا اس سے ملنا، پر نبیلہ سے وہ خوش دلی سے ملتی تھی۔

کچھ ہی دنوں بعد بی۔ بی۔ اے والوں کی فریشرز پارٹی تھی۔ دونوں ہی شدت سے پارٹی میں جانا چاہتے تھے۔ عروج نے نبیلہ کی خوشامد کی اور اس نے دونوں کو پارٹی میں آنے کی اجازت دیدی۔

"ہم پارٹی کے دوسرے دن بتائیں گے سب کو". عروج نے فیصلہ کیا۔

"ہاں اس فائزہ کا تو جل کر برا حال ہونا ہے" . سنایا نے تھالی بجائی۔

سنایا عروج کے گھر پر تھی، عروج کے لئے ڈریس کا انتخاب کیا جا رہا تھا، سنایا نے اس کے لئے گلابی رنگ کا جوڑا پسند کیا۔

وزیر احمد مصباحی (بانکا)

یومِ آزادی:___ کیا ہم سچ میں آزاد ہیں؟

واقعی اگر آپ دنیاوی ممالک کی تاریخ اور اس کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہمارا وطن عزیز "ملک ہندوستان" وہ واحد ملک ہے، جہاں جمہوری نظام بڑے اچھوتے پیمانے پر قائم ہے . یہی وہ ملک ہے جہاں تمام مذاہب کے لوگ بلا اختلاف رنگ ونسل ایک ساتھ مل جل کر زندگی گزر بسر کرتے ہیں . یقیناً اس میل ملاپ اور آپسی بھائی چارگی کی بنیاد یہاں کی رنگا رنگ تہذیب وتمدن اور بوقلمونی ہی پر منحصر ہے . آزاد بھارت سے پہلے یہاں تقریباً سو سالہ ایسی انگریزی حکومت قائم رہی ہے جو ظلم وستم کی رو سے اتنی جری تھی کہ ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں ایک غلامانہ زندگی گزارنے پر مجبور کیے ہوئی تھی . مگر قربان جایئے وطن عزیز کے ان جواں ہمت اور قابل فخر مجاہدین آزادی پر جنھوں نے اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر آزادی وطن کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی اور انگریزی حکومت سے ایسی سخت معرکہ آرائی کی کہ انھیں ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کر دیا؛ تب کہیں جا کر ۱۵، اگست ۱۹۴۷ء/کو ہمارا ملک آزاد ہوا اور پھر لگے ہاتھ ۲۶، جنوری ۱۹۵۰ء/کو مادر وطن ایک آزاد جمہوری ملک بھی بن گیا . یقیناً اسی بڑے دن کے لیے گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبد الغفار خان، علامہ فضل حق خیرآبادی اور علامہ عنایت احمد کاکوروی جیسے عظیم سپوتوں اور رہنماؤں نے بلا امتیاز مذہب و ملت اور رنگ ونسل اپنی کڑی محنت ولگن کے سہارے ہر ہندوستانی باشندوں کی رگ جاں میں حریت کی ایسی روح پھونک دی تھیں کہ انھوں نے اس راہ میں درپیش تمام کلفتوں کو خوشی خوشی برداشت کر لیا . حتی کہ وقت آنے پر تختہ دار کے ساتھ ساتھ موت سے بھی رشتہ جوڑتے گریز نہیں کیا . ہاں! یہ بھی یاد رہے کہ اس دن کا یہ پس منظر ہندی تاریخ سے کبھی بھی محو نہیں کیا جا سکتا ہے جب ۱۹۳۹/ میں لاہور کے مقام پر دریائے راوی کے کنارے انڈین نیشنل کانگریس نے اپنے ایک تاریخی اجلاس میں جس کی صدارت ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کی تھی، ڈومنین اسٹیٹس کے بجائے مکمل آزادی کے حصول کو اپنا واضح نصب العین قرار دیتے ہوئے ۲۶، جنوری کو یومِ آزادی کے طور پر منانے کا ایک تاریخی فیصلہ کیا . شاید وطن کے نام پر مر مٹنے والا یہی وہ جوش وجذبہ اور امنگ حوصلہ تھا کہ جو آج بھی یہاں کی ہندی خمیر میں بدرجہ اتم موجود ہے . تھوڑے ہی عرصے میں پھر تو ایسی بادِ نسیم چلی کہ یہاں کے تمام باشندوں کو وطن عزیز کے ایک ایک ذرہ سے دلی پیار اور قلبی لگاؤ سا ہو گیا . ہاں! اسی وقت سے یہاں کی پرسکون فضا میں نشو ونما پانے والی ہر ایک جان کے نہاخانہ دل میں مادرِ وطن کی تحفظ وبقا کے خاطر ایک ایسا منفرد جذبہ قائم ہو گیا کہ وہ آج بھی ایک وفادار ہندوستانی کے دل میں ہر لمحہ پروان ہی چڑھتا رہتا ہے. جسے ہم آج بھی فوجی پریڈ، جھانکیوں کی نمائش اور تقریبات کی صورت میں دیکھتے ہیں .

مگر افسوس کہ آج کی اس ترقی یافتہ اور بھری آبادی میں پتہ نہیں کبھی کبھی ایسا کیوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم مکمل طور پر آزاد اور خود مختار نہیں ہیں. عملی دنیا کی حقیقت ہمیں کچھ اور ہی بتانے پر مجبور کرتی ہے . سچ پوچھیں تو آج بھی ہمارا ملک مکمل

طور پر آزاد اور یہاں کی عوام الناس فارغ البال نہیں ہیں . جی! یہ بالکل ایک زندہ اور کھلی حقیقت ہے کہ یہاں سے انگریز حکومت کا خاتمہ ہوئے ایک طویل عرصہ ہونے کو ہے، وہ لوگ جا چکے ہیں . دور؛ کوسوں دور . مگر موجودہ سیاسی حکمراں اور جماعتیں بھی تو ہر وہ کام کرنے میں ذرا بھی پیچھے نہیں ہیں جو کام ایسٹ انڈیا کمپنی کبھی کھلے عام کیا کرتی تھی . پھوٹ ڈالو اور راج کرو کی حکمت عملی جو انگریز نے اپنائی تھی آج وہی حکمت عملی اور ایجنڈا بی جے پی حکومت اپنا رہی ہے اور دن بدن مسلمان و ہندو کے نام پر ووٹ بینک کے خاطر ہر ناجائز کام کرنے کے لئے اتاولے ہو رہی ہے۔آج تعلیمی، معاشی، اقتصادی، بیروزگاری اور بیماری کا ایک ایسا سنگین حصار ہمارے اردگرد قائم کر دیا گیا ہے جہاں نہ تو خوشیوں کا داخلہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی کسی نوعیت کی آزادی کی گزر بسر. بیچارے محنت کش عوام جو خون پسینہ ایک کر دیتے ہیں، اسے اپنی کمائی اور بھرپور محنت کا مکمل صلہ بھی نہیں مل پاتا . ہر طرف سے مہنگائی کی مار میں اگر کوئی دھکا بھی کھاتے ہیں تو وہ بیچارے غریب ہی ہوا کرتے ہیں . چند برسوں پہلے بینک کی قطاروں میں اگر کسی کی جان ہلکان بھی ہوئی ہے تو وہ بھی ان مزدوروں اور کسانوں ہی کے نصیب میں آئی ہے اور جی ایس ٹی کی قہر تو اس پر مستزاد.

اوہ! چھوڑیں یہ تو ایک الگ ہی نوعیت کا مسئلہ ہو گیا. آج کی اس سوشل میڈیائی اور جدید ٹکنالوجی کے دور میں جب کہ پورا معاشرہ اس کی چپیٹ میں آ گیا ہو، کیا بچے اور کیا بوڑھے، ہر ایک افراد کا دن رات اس کی رنگینیوں میں گم رہنا، آپ کو ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا کر دینے کے لیے کافی ہے . جب ایک گھر میں رہ رہے تمام افراد کا ذہن کسی ضروری امر سے ہٹ کر کسی غیر ضروری چیز پر مرتکز ہو جائے تو پھر اس ضروری ش ء کو لے کر انسانی طبیعت گھبرانے سی لگتی ہے کہ کہیں یہ ضروری امر بلکل فراموش اور حاشیہ ذہن سے مضمحل نہ ہو جائے . یہ ایک ایسا فطری کنکشن ہے جسے کوئی بھی سنجیدہ فہم اپنے اندر محسوس کر سکتا ہے . آج کی بڑھتی آبادی میں نسل نو کا سوشل میڈیا سے جنون کی حد تک لگاؤ کو دیکھ کر بلکل یہی صورت حال مجھ جیسے عام انسانوں کے دلوں میں بھی پیدا ہونے لگتی ہے . ایک عجیب قسم کا کھٹکا ہوتا ہے اور ذہن و دماغ کے دریچے میں گردش کرنے لگتا ہے کہ یا اللہ! کہیں ایک وقت ایسا نہ آ جائے کہ آج کی یہ مادیت گزیدہ نوجوان کل چل کر اپنے ان جاں باز مجاہدین آزادی کو بھی فراموش نہ کر دے . ان کے تذکروں سے انھیں نفرت سی نہ ہونے لگ جائے اور پھر ایک وقت ایسا بھی آ جائے کہ ان سرفروشان وطن جیسا جذبہ اور امنگ حوصلہ کی ان سے توقع رکھنا سراب سے زیادہ اہمیت کا حامل نہ ہو. (خدا ایسا دن نہ دکھلائے) اور آج کے اس برقی ذرائع کے سامنے انھیں آزادی وطن کے حوالے سے مجاہدین آزادی کی یہ سچی داستانیں بلکل فرضی اور گڑھی ہوئی سی نہ معلوم ہونے لگ جائے . ہاں! اور وہ بھی ایک ایسے دور میں جب کہ آج این سی آر ٹی کے بہانے ملکی سطح پر میڈل اور ہائی اسکولوں میں رائج کتابوں سے مجاہدین آزادی کی داستانیں اور ملکی آزادی کے آثار و شواہد کو مٹانے کی مہم سی چلی ہو . آج تو ذات پات کے نام پر ان مجاہدین آزادی سے بھی وہ مذہبی منافرت کا کھیل بھی کھیلا جا رہا ہے جس کا انھوں نے تصور بھی نہیں کیا ہوگا.

جو قوم اپنے اسلاف اور گزشتہ روایات کو بھلا دیتی ہے، تاریکی، اور ذلت و پسپائی اسی کا مقدر بن ہی جاتی ہے. آج کتنی ہی ایسی قومیں ہیں جو محض اس لیے گمنام ہو گئیں ہیں کہ انھوں نے اپنے تہذیبی روایات سے آنکھیں پھیر لیں تھیں. آج ہمارا، آپ کا، والدین اور گارجین وذمہ دار وغیرہ تمام افراد کا یہ مشترکہ اخلاقی فریضہ بنتا ہے کہ ہم اور آپ مل کر اپنے سے

چھوٹوں، بھائیوں، بہنوں اور آنکھ کے ٹکڑوں کو ان مجاہدین آزادی کے ذریں کارناموں سے روشناش کرائیں . ان کے تذکروں پر مشتمل کتابیں خرید کر دیں کہ آج کی یہ ہماری نئی نسل ان سے واقف ہو سکے . موقع بہ موقع آپ انھیں بلکل سنجیدگی کے ساتھ ہمت و بہادری پر مشتمل قصے اور کہانیاں بھی سنایا کریں اور ساتھ ہی ساتھ اگر کبھی فرصت کے لمحات میسر ہوں تو ان سادہ ذہن بچوں کو آزادی کے آثار و شواہد کی بھی زیارت کرالائیں؛ تا کہ ان کے دلوں میں بھی ہمت و جزبہ اور امنگ و حوصلہ پروان چڑھ سکے . اور خدا نا خواستہ پھر کل کبھی جب بات آ جائے ملکی تحفظ اور اس کے سلم و سلامتی کی تو یہ بچے دشمنوں سے مقابلہ کرنے میں بزدلی کا شکار نہ ہونے پائیں . ساتھ ہی ساتھ آپ انھیں یوم جمہوریہ کے موقع پر اسکول، کالجس اور سرکاری دفاتر میں اپنے ساتھ لے جائیں، اس دن صفائی و ستھرائی کا خاص خیال رکھیں، قومی ترانے گنگنائیں، مجاہدین آزادی کی شخصیت پر روشنی ڈالیں اور قومی پرچم "ترنگا جھنڈا" لہرائیں تا کہ ان کے ذہن و دماغ میں اس دن کی اہمیت صحی طریقے پر راسخ ہو سکے.

قابل توجہ بات یہ بھی ہے کہ ادھر چند برسوں سے (جب کہ ہماری آزادی کو ایک طویل عرصہ ہونے کو ہے) کچھ بھگوا پرستوں اور یہاں کی گنگا جمنی تہذیب دشمن عناصروں کو وطن عزیز کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھا رہی ہیں . وہ ہر لمحہ یہاں کی آپسی بھائی چارگی اور پیار و محبت پر کاری ضرب لگانے کی تاک میں لگا رہتا ہیں . آج وہ ایک ایسے طبقہ سے جنھوں نے وطن عزیز کی آزادی میں اہم رول ادا کیا ہے، وفادار وطن ہونے کا ثبوت مانگ رہے ہیں . آج انھیں شر پسندوں کی وجہ سے ملک کے تقریباً ہر گوشے میں اقلیتوں پر ایسا خوف و دہشت طاری ہیکہ جس کی وجہ ہے ملکی ترقی، جمہوری نظام اور پیار و محبت و گنگا جمنی تہذیب کا شیرازہ بلکل بکھرتا ہوا نظر آ رہا ہے. اور اس وقت مودی حکومت تو سیاہ قانون این آر سی، این پی آر اور سی اے اے وغیرہ لاکر کر اپنی ہندو مسلم دشمنی کا بین ثبوت پیش کر دی ہے۔ ملک میں اس وقت ہر طرف ایک ہا کار سا مچا ہوا ہے لوگ سڑکوں پر احتجاجات و مظاہرہ کر رہے ہیں، ملک میں ہر طرف شاہین باغ ایسا منظر دیکھنے کو مل رہا ہے۔۔۔۔ مگر حکومت ہے کہ ان مظاہرین کو جواب دینے اور سیاہ کان واپس لینے کے بجائے وزیر داخلہ امت شاہ ہٹ دھرمی پہ اتر آئے ہیں اور وہ ایک قدم بھی نہ ہٹنے کے بعد کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر سال جب ۱۵، اگست کا یادگار دن آتا ہے تو نہ جانے مجھ جیسے عام انسانوں کے دلوں میں یہ احساس مزید بڑھ جاتا ہے کہ اے کاش! ہم اپنے مادر وطن کو ان شر پسندوں کے چنگل سے کسی طرح آزاد کرانے میں کامیاب ہو جاتے . تا کہ ہمارا یہ ملک اپنی گنگا جمنی تہذیب و تمدن کی بقا اور مزید ترقیوں کے ساتھ ساتھ اقوامِ عالم پر اپنا ایک الگ شناخت قائم کرتا اور ہمارے مجاہدین آزادی کے وہ سنہرے خواب بھی شرمندہ تعبیر ہو پاتے جو انھوں نے انگریزوں سے نبرد آزمائی کے وقت سنسان راتوں میں دیکھا تھا. آج ایک ایسا طبقہ ہمارے سامنے ابھر کر آیا ہے جو گاندھی کے قاتل گوڈ سے کو اور ساور کر کو اپنا رہنما مانتا ہے۔ وہ ٹی وی چینل پر بھی جا کر کھلے دل سے اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ گاندھی جی نے صحیح نہیں کیا تھا، انہوں نے بس اپنے مفاد کے لئے کام کیا تھا اس سے بہتر تو گوڈ سے اور ساور کر ہیں جو ایک بہترین آڈیولوجی رکھتے ہیں۔ اس لیے آج ہر ایک وہ طبقہ جو امن پسندی کی بات کرتا ہے اور جمہوریت پر یقین رکھتا ہے اسے اس کے کوشش کرنا پڑے گا کہ کسی طرح ہمارا ملک ان لوگوں سے آزاد ہو جائے اور جمہوری نظام حسن و خوبی کے ساتھ چلتا رہے۔

اگر آپ بھی ایسا سوچتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسا ہی ہو تو آیئے! آج ہی ہم اپنے اپنے عقل و خرد کی کسوٹی پر یہ اہم

فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم مادر وطن کی ترقی کے لئے ہر لحہ کوشاں رہیں گے. اس کی تحفظ و بقا اور سلم وسلامتی کے خاطر وقت آنے پر اپنی جان تک کی بازی لگادیں گے اور سماج ومعاشرے میں زندگی گزار رہے سنجیدہ اور امن پسند افراد کے ساتھ مل کر ان شر پسندوں کا مکمل بائیکاٹ کریں گے جنھیں ملکی ترقی، یہاں کی خوبصورت گنگا جمنی تہذیب، اخوت و بھائی چارگی اور آپسی پیار ومحبت ایک آنکھ نہیں بھاتیں. (انشاءاللہ)

(بقیہ ص:۴۲/کا).....

ان کی عروض دانی کی دلیل ہے، انہوں نے ایک طویل قطعہ تاریخ کہا تھا، اس کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے ''فنی اعتبار سے ایک معیاری قطعۂ تاریخ ہے اس کے ہر پہلے مصرعہ سے سن عیسوی اور دوسرے مصرعے سے ہجری تاریخیں نکالی ہیں''۔ بطور مثال :

مرے استاد عالی جاہ غالبؔ ۔ ۱۸۶۹ء
دوم ذی القعد کو اب مرگئے آہ ۔ ۱۲۸۵ھ
جہانگیر سخن ملک سخن سے ۔ ۱۸۶۹ء۔
ہوئے رضواں مآب الحکم للہ ۔ ۱۲۸۵ھ

اس کے علاوہ اس کتاب میں تاریخ گوئی کی روایت پر مفصل مضمون بہت ہی محنت سے لکھا گیا ہے، مذکورہ شعرا کے علاوہ حبیب اللہ ذکاؔ، بے صبرؔ سکندر آبادی، منشی جواہر سنگھ جوہرؔ، یوسف علی خان عزیزؔ، منشی بہاری لال مشتاقؔ، نشاطؔ اکبر آبادی، سیاحؔ، نساخؔ، قدرؔ بلگرامی، حاتم علی مہرؔ، علائیؔ، ولیؔ، منیرؔ شکوہ آبادی وغیرہ کے تاریخی قطعات کا تذکرہ غالبؔ اور غالبیات سے تعلق رکھنے والے باذوق حضرات کے لیے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں، جس کا مطالعہ علم میں اضافہ کا سبب ہوگا۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد (ملک پیٹ)

لڑکیوں کی اعلیٰ دینی وعصری تعلیم کا فکری واصلاحی معیاری مرکز

شعبہ جات: تحفیظ القرآن الکریم ★ شعبہ ابتدائیہ (دوسال)
★ شعبہ عالمیت (چارسال) ★ شعبہ فضیلت (دوسال)

☆شہر سے اہم مقامات سے آمدورفت کی سہولت ☆دور دراز کی طالبات کے لیے ہاسٹل کا نظم ☆عثمانیہ یونیورسٹی سے میٹرک تا ایم۔اے امتحانات دلوانے کا نظم

لڑکیوں کے لیے قرآن، حدیث، فقہ، ادب، سیرت، تاریخ کے علاوہ انگریزی زبان کے اعدادیہ تا فضیلت چھ سال تعلیم کا بہترین نظم ہے

رابطے کے لیے پتہ:
JAMIATUL BANAT AL-ISLAHIYAH
#16-3-993/1, NEAR DAWN HIGH SCOOL
OFFICERS COLONY, NEW MALAKPET,
HYDERABAD(T.S) INDIA 500036

نصب العین: انقلاب بذریعہ تعلیم قرآن وسنت کی گہری بصیرت، شہادت حق، احیائے دین کی استعداد اور امت کے لیے داعیانہ، مجاہدانہ اور قائدانہ کردار کی حامل ''المرأۃ الصالحۃ'' ٹیم کی تیاری۔
☆شعبہ تحفیظ القرآن اور شعبہ ابتدائیہ وعالیت کے پہلے سال میں داخلے سال بھر جاری رہیں گے۔ اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے خواہشمند سرپرست حضرات سے اپنی لڑکیوں کے ہمراہ جلد رجوع ہونے کی خواہش کی جاتی ہے۔

جامعۃ البنات الاصلاحیۃ حیدرآباد کا استحکام وقت کا اہم تقاضہ اور ملی فریضہ ہے۔ اس اہم مرکز کی تعمیر وترقی ک لیے مالی اور اخلاقی تعاون فرما کر ہمارے حوصلے کو قائم رکھیں۔

ناظم: مولانا عبدالعلیم اصلاحی
موبائل 9676202819

عبد اللہ کمال اکمل

ہم اپنے بچوں کی تربیت کیسے کریں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ ''ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی نصرانی یا مجوسی بنا لیتے ہیں (متفق علیہ)

ایک جگہ آپ نے ارشاد فرمایا ''جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے اعمال بند ہوجاتے ہیں مگر تین ایسے اعمال ہیں جو جاری رہتے ہیں، صدقہ جاریہ، علم جس سے استفادہ کیا جائے اور نیک اولاد جو اس کے لئے دعا کرے''۔

اولاد اللہ تعالی کی عظیم نعمت ہے اس کا حقیقی احساس صرف اسے ہوسکتا ہے جو اس نعمت سے محروم ہو، انسان اس بات کا مکلف ہے کہ وہ اللہ رب العزت کی عطا کردہ نعمتوں کا صحیح استعمال کرے، جب بات اس کے مثبت استعمال کی ہو تو راست اور صالح تربیت سے بڑھ کر کیا ہوسکتا ہے، اس لئے والدین کی اولین ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے بچوں کی مناسب تعلیم و تربیت پر دھیان دیں، ہمارے بچوں کی ناکامی ایک بہت بڑی وجہ والدین اور اساتذہ کا بچوں کی تربیت سے ناآشنا ہونا ہے جس کی وجہ سے بچہ اپنی صلاحیتوں کو نہیں پہچان پاتا اور پھر زندگی کے عملی میدان میں وہ ناکام ہوجاتا ہے۔

ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا بچہ کسی کا محتاج نہ ہو، وہ خود اعتماد ہو، وہ زندگی کو بوجھ نہیں بلکہ اسے چیلنج سمجھتے ہوئے اس سے لطف اٹھا سکے، وہ دوسروں سے مل جل کر زندگی کی دلچسپیوں میں شریک ہو، وہ نہ صرف یہ کہ اسکول بلکہ تمام شعبہ ہائے حیات میں نمایاں کارکردگی انجام دے سکے، اور والدین کے لئے فخر کا سبب بنے، وہ انسانیت کی خدمت کرسکے، دنیا اس کی تعریف کرے اور وہ اپنے میدان عمل میں بے مثل ہو غرض کہ اس کے پاس دولت، شہرت طاقت اور اختیار سب کچھ ہو۔

یقین کریں خواہشات ہر والدین کی ہوتی ہیں، ان کا بچہ ٹاٹ والی کٹیا میں آنکھ کھولے یا ایک شاندار محل میں، سب والدین جاہتے ہیں کہ بچہ ان کی آنکھوں کا تارا اور قابل انسان بن کر اپنا اور ان کا نام روشن کرے لیکن کیا سارے والدین کی نیک تمنائیں پوری ہوتی ہیں یقیناً نہیں!

آئن سٹائن، نیوٹن اور ایڈیسن جو اپنے وقت کے عظیم سائنسداں رہے ہیں یہ اپنے بچپن میں انتہائی متوسط طالب علم اور معمولی صلاحیت کے لوگ تھے لیکن کس چیز نے ان کو اتنا طاقتور بنا دیا کہ یہ لوگ وقت کی دیواریں توڑ کر آج انسانی حافظے کا حصہ بن گئے۔ ہمارے پاس دوسروں کی کامیابی اور اپنی ناکامی کی صرف ایک وجہ ہوتی ہے اور وہ ہے ''قسمت''۔

جب آپ صرف ایک وجہ کو حتمی مان لیتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آپ کبھی بھی حقیقت شناس نہیں ہوپاتے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ''سیب اور کیلے'' پر لیکچر سن کر یا اس موضوع پر کتابیں پڑھ کر آپ ان کے ذائقے سے مکمل طور سے واقف ہوجائیں، ان پر طول طویل گفتگو اور بحث کرنے سے بہتر ہے کہ آپ ایک مرتبہ اسے چکھ لیں حقیقت کا آپ کو خود بخود علم ہوجائے گا، معلوم ہوا کہ ہر چیز کی وجہ قسمت نہیں ہے صرف قسمت پر الزام لگا کر ہم غیر ذمہ داری کا رویہ اپنا لیتے ہیں۔

ذیل میں ان اسباب اور اصول کا ذکر کریں گے جن سے کوئی بچہ کامیاب انسان بن جاتا ہے اور کوئی ناکام ہوجاتا ہے، ہم کامیاب ترین والدین کیسے بنیں گے اور اس کے لئے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔

پہلے کس کو بدلیں:

ہر بے بس انسان اپنی بے بسی کا اظہار گلہ شکوہ کرکے کرتا ہے اور گلہ وہ تیر ہے جو کمان سے تو نکل جاتا ہے لیکن کبھی نشانے پر نہیں بیٹھتا، ہر گلہ کرنے والا انسان غیر ذمہ دار ہوتا ہے، وہ عمل نہیں

کرتا، محنت سے جی چراتا ہے اور کوشش سے بھاگتا ہے اور محض گلہ کرتا رہتا ہے اس لئے کچھ نہیں بدلتا اور یہی اور یہی وجہ ہے کہ وہ جو کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کا اس کو علم بھی نہیں ہوتا، یا درکھیں آپ حالات زمانہ نہیں بدل سکتے، آپ موسموں کے تغیر کو نہیں بدل سکتے، آپ اپنے رنگ وروپ، قد وقامت کو نہیں بدل سکتے ہاں اگر آپ بدل سکتے ہیں تو خود کو بدل سکتے ہیں اور یہ مکمل طور سے آپ کے اختیار میں ہے، خود کو بدلنے کی ذمہ داری قبول کریں۔

''اگر آپ کو درخت کا پھل بدلنا ہے تو آپ کو درخت کا بیج بدلنا ہوگا، اس سے بڑی حماقت کوئی نہیں کہ کوئی گندم بوئے اور امید جاول کی رکھے۔ ﴿سقراط﴾

اپنے بچوں میں انقلابی تبدیلی لانے کے لئے پہلے اپنے اندر انقلاب لے کر آئیں، یاد رکھیں یہ آپ کے بچے ہیں یہ فصلیں آپ کی زمین پر اگی ہیں زمین زرخیزی ہی فصلوں کو شادات کر سکتی ہے، اس لئے بچوں میں مثبت تبدیلی لانے کے لئے سب سے پہلے ہم کو خود بدلنا پڑے گا۔

بچے کی قسمت، تقدیر اور مستقبل کا انحصار ان واقعات پر نہیں جو اس کے ساتھ پیش آئے بلکہ اس ردعمل پر ہے جو اس نے کسی واقعہ پر ظاہر کیا اور یہ ردعمل اسنے عموماً والدین ہی سے سیکھا ہوتا ہے، مثلاً یہ عمومی نفسیات ہے کہ اگر بچے کو گالی دی جائے تو وہ غصہ میں آئے گا یا جوابی طور پر گالی دے گا لیکن اگر بچپن میں یہ واقعہ اس نے اپنے والدین کے ساتھ ہوتے دیکھا اور گالی کے جواب میں اس کے والدین دوسرے کو معاف کر دیں کہ یہ اخلاقیات کے خلاف ہے بھلا میں کم ظرف کے جواب میں کم ظرف کیسے بن سکتا ہوں تو یقیناً یہ بچہ کبھی اس واقعہ کے ردعمل میں غصہ کرنے کی بجائے معاف کر دے گا، اس مثال سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ:

آپ بچوں کی زندگی میں ہونے والے واقعات کو تبدیل کرنے کے بجائے ان واقعات کے ردعمل کو تبدیل کرنے کا درس دیں نتائج خود بخود بدل جائیں گے۔

تمام الزام تراشیاں بے کار ہیں، جتنا مرضی آپ دوسروں کو برا کہہ لیں کتنے ہی برے حالات کا سامنا کرنا پڑے کچھ نہیں بدلے گا اگر آپ نہیں بدلیں گے (وائن ڈبلیو ڈائر)

بچوں میں خوداعتمادی پیدا کریں:

بچہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کی جائے، بات بات پر سرزنش سے بچہ خوف کی نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے اور پھر اس کے اندر خود اعتمادی کا فقدان ہونے لگتا ہے، شکسپیر کا قول ہے: میں نے دنیا کے خوب صورت نظارے دیکھ لئے لیکن اس منظر سے حسین کوئی منظر نہیں کہ میں کسی بچے کو پر اعتماد دیکھوں ''زندگی ایک جنگ ہے اور اس جنگ میں جیت اسی کی ہوتی ہے جو خود پر یقین رکھتا ہو، جسے اپنی صلاحیتوں پر یقین ہو کہ وہ کچھ کر گزرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ایسا شخص وقتی طور پر ناکام تو ہو سکتا ہے لیکن خود اعتمادی کی طاقت اسے مکمل ناکام نہیں ہونے دے گی اور وہ کسی نہ کسی مرحلہ میں کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

خود اعتمادی جیت کے لئے ایک زبردست ہتھیار ہے، ہمارے ملک میں بچوں اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس سے محروم ہے، دنیا کے بہترین ماہر نفسیات اپنی تحقیق سے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ بچے خود اعتمادی کی کمی کی اصل وجہ بچپن میں والدین کی تربیت کی نااہلی ہوتی ہے۔

جو جیتتے ہیں ان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ جیت جائیں گے، آپ کچھ بھی حاصل کر سکتے ہیں اگر آپ کے اندر یہ یقین رچا بسا ہے کہ آپ اس کے حقدار ہیں، خود پر اعتماد کرنا ایک ذہنی رویہ ہے جو ہم کسی بھی بچہ میں پیدا کر سکتے ہیں، بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے یہ اقدام کریں۔

اپنے کاموں میں ان سے مدد لیں۔

انھیں خود بھی اپنا کام کرنے دیں اس لئے کہ جو والدین اپنے بچوں کے لئے سب کچھ کرتے ہیں ان کے بچے ان کے لئے کچھ نہیں کر پاتے۔

بچوں کو غلطیاں کرنے دیں، بچے غلطیوں ہی سے سیکھتے ہیں۔

انھیں اپنے بعض فیصلے خود کرنے دیں تاکہ ان کے اندر قوت فیصلہ پیدا ہو سکے۔

انھیں منصوبہ بندی کا عادی بنائیں۔

بچوں کی نفسیات کا بغور مطالعہ کریں اور انہیں ان کی

خوبیوں سے آشنا کروانے میں مدد کریں۔

انھیں روپے پیسے کے حساب کتاب کرنے کا عادی بنائیں۔

بچے کو بازار لے جائیں اور اسے کہیں کہ وہ کوئی چیز خریدے۔

بچوں کی مختلف شعبوں خاص طور سے انتظامی شعبہ جات سے تعلق رکھنے والے افراد سے بات چیت کروائیں۔

یہ کچھ ایسے نقاط ہیں جن کو اپنا کر ہم اپنے بچوں میں خود اعتمادی پیدا کر سکتے ہیں ورنہ اس کی صلاحتیں پوشیدہ رہ کر ختم ہوجائیں گی اور اس سے نہ تو اسے کوئی فائدہ ہوگا اور نہ ہی انسانیت اس سے مستفید ہوسکتی ہے، اگر بچہ کو اپنی ذہانت اور قابلیت پر یقین نہ ہو وہ ایک ایسا سورج ہے جس کی روشنی چراغ سے زیادہ نہیں۔

انسان صحیح معنوں میں زندہ اس وقت رہنا شروع کرتا ہے جب وہ اپنے آپ پر اعتماد کرنا شروع کر دیتا ہے۔ (ڈاکٹر نورمن پیل)

تعریف کے موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں:

انسان کو عمومی طور پر اپنی خامیاں نظر نہیں آتیں او ر دوسرے کی خوبیاں نہیں دکھتیں، انسان ہی وہ جنس ہے جس میں خالق کائنات نے سیکھنے کی صلاحیت رکھی ہے اور دلچسپ یہ ہے کہ انسان اپنی غلطیوں سے جتنا سیکھتا ہے اتنا کسی اور چیز سے نہیں، آپ بچوں میں غلطیاں تلاش کرنا چھوڑ دیں اور وہ موقعہ تلاش کریں جب آپ کا بچہ کوئی اچھا کام کرتا ہے، جب بھی وہ کوئی اچھا کام کرے تو فوراً اس کو انعام دیں اور بہترین انعام سچی تعریف ہے۔

''بچہ کی تقدیر ان لمحوں میں بن رہی ہوتی ہے جب کوئی اس کی سچی تعریف کر رہا ہوتا ہے'' (کین بلنچرڈ)

ہر بچہ وہ کام بار بار کرتا ہے جس میں اس کو لطف محسوس ہو، تعریف میں کسے لطف محسوس نہیں ہوتا، پس بچہ جب کوئی اچھا کام کرے اور اسے فوراً تعریف کا انعام دیا جائے تو وہ اچھے کاموں کو اپنی عادت بنالیتا ہے اور یہ عادتیں اس کی شخصیت کو نکھارنے اور مؤثر بنانے میں مددگار بن جاتی ہیں، لہذا والدین کو چاہئے کہ وہ بچے کو کوئی ذمہ داری سونپیں اور اس کی تکمیل پر اس کی تعریف کرنا نہ بھولیں اس طرح بچہ کے اندر احساس ذمہ داری کے ساتھ اچھی عادتوں کی پرورش ہوتی ہے۔

تعریف کرنے کے مواقع:

بچہ جب آپ کے لئے پانی لے کر آئے۔

بچہ آپ کے لئے چیزیں اور سامان سمیٹنے میں مدد کرے۔

بچہ کوئی اچھی بات سنائے۔

بچہ اپنے بوٹ خود پالش کرے۔

بچہ اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرے۔

بچہ کہنا مانے۔

بچہ کوئی آیت یا کلمہ سنائے۔

جب بچہ غلطی کرتے تو زدوکوب کرنے کے بجائے چہرے پر ایسے تاثرات لے کر آئیں جس سے پتہ چلے کہ آپ کو اچھا نہیں لگا

کسی نامناسب حرکت پر زبان سے منع کریں۔

بچے کی تذلیل اور تحقیر نہ کریں اس طرح اس کی ساری شخصیت تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

غلطی کے حوالہ سے منع کرنے کے بعد اگر وہ دوبارہ غلطی کرے تو بار بار اسے کچھ نہ کہیں بلکہ نظر انداز کریں، کبھی کبھی بچہ بار بار غلطیاں اور شرارتیں اس لئے کر رہا ہوتا ہے کہ آپ اس پر توجہ دے رہے ہوتے ہیں توجہ ہٹا دیں تو وہ شرارتیں نہیں کرے گا۔

مار ایک ایسا حل ہے جس سے بچہ یا تو ٹھیک ہوجاتا ہے یا پھر ضدی ہوجاتا ہے، کوشش کریں کہ بچے کو نہ ماریں، ہاتھوں کا استعمال وہ لوگ زیادہ کرتے ہیں جن کو دماغ استعمال کرنے کی عادت کم ہو۔

بچوں سے محبت کریں:

درختوں اور پودوں کو نشوونما پانے کے لئے دھوپ اور پانی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح بچوں کو بھی ذہنی نشوونما کے لئے محبت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بچے جلدی سمجھدار ہو جاتے ہیں جن کو والدین کی محبت اور توجہ ملتی ہے، صرف کھلانا، پلانا، کھلونے اور اچھے کپڑے مہیا کرانا ہی محبت کا اظہار نہیں ہے بلکہ ان چیزوں سے ساتھ کے ساتھ گھر میں خلوص و پیار والا ماحول مہیا کرانا بھی ہماری ذمہ داری ہے، جب تک بچہ کو اپنے چاہے جانے کا احساس نہ

ہواس میں خود اعتمادی پیدا نہیں ہوتی اس لئے غذا اور کپڑوں سے زیادہ محبت کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ چیزیں بچوں کے اندر پختگی کے واسطے بنیاد ثابت ہوتی ہیں۔

ماہرین کی رائے میں بچے کی شخصیت پر ماں باپ کے آپسی تعلقات کا گہرا اثر پڑتا ہے، اگر بچہ نے دیکھا ہے کہ امی ابو سچی اور بے لوث محبت کرتے ہیں تو اس کی شخصیت میں محبت ایک اہم قدر کے طور پر جگہ بنالے گی، وہ ساری زندگی دکھ اور درد کو اپنی ذات پر غالب نہیں آنے دے گا، وہ محبت بانٹے گا اور محبت وصول کرتے گا، والدین کے آپس میں لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے ہر دس میں سے ایک بچہ ذہنی معذوری یا نفسانی بیماری کا شکار بن جاتا ہے، بچوں میں مجرمانہ ذہنیت کی پرورش اونشوونما کی بہت بڑی وجہ ان کے والدین کی آپس میں ناچاکی ہے، اس لئے والدین کا خوش گوار تعلق انتہائی ضروری ہے۔

خوف سے بچوں کی حفاظت کریں:

دنیا میں ہر شخص کسی نہ کسی خوف میں ضرور مبتلا ہوتا ہے لیکن حیران کن بات یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ حقیقی خوف کے بجائے فرضی اور خود ساختہ خوف میں مبتلا ہوتے ہیں، خوف کی نفسیات بچے کے لئے سم قاتل ہے، خوف زدہ بچے کی تمام صلاحیتیں ماند پڑ جاتی ہیں اور اس کے ذہن کی ساری توانائی خوف پر صرف ہونے لگتی ہے او اس طرح اس کی سوچ مثبت اور پرامید نہیں ہو پاتی۔

عام طور پر بچوں میں خوف پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھیں بچپن میں جنات، بھوتوں سے ڈرایا جاتا ہے اور پھر وہ ڈر ساری زندگی اس کی شخصیت کا حصہ بن کر رہ جاتا ہے، کسی بھی قسم کا غیر ضروری خوف بچے کی نفسیات کو تباہ برباد کر دیتا ہے۔

مشہور ماہر نفسیات پال ہاک کے مطابق خوف سے نمٹنے کے حوالہ سے ان باتوں کو ضرور مدنظر رکھیں:

بچے کو کبھی بھی تمسخر کا نشانہ نہ بنائیں اور اس کو بزدل اور ڈرپوک مت کہیں اس طرح بچے کا اعتماد مجروح ہوتا ہے اور وہ ساری زندگی ڈر ڈر کر گزارے گا۔

بچے کو خوف چھپانے پر مجبور نہ کریں اگر آپ خوف زدہ بچے کا مذاق اڑائیں گے تو وہ خوف کو چھپائے گا اور خوف کا چھپانا دراصل اس سے نمٹنے کا ایک غیر معقول طریقہ ہے۔

بچے کو بہادر بنانے میں جلدی نہ کیجئے کیونکہ کوئی بھی چیز سیکھتے آتی ہے۔

یاد رکھیں بچوں کو مدد کی سب سے زیادہ ضرورت تب ہوتی ہے جب وہ خوف زدہ ہوں یا ناکام ہو جائیں اس لئے خوف سے نمٹنے کے لئے بچے کو کبھی بھی اکیلا نہ چھوڑیں بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کریں۔

ان کو ایسے لوگوں کی کہانیاں سنائیں جنھوں نے اپنی ناکامی اور خوف پر قابو پا کر بڑا نام کیا، اس طرح انہیں یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ناکامی کوئی قیامت نہیں ڈھا دیتی بلکہ اس کے بعد بھی منزلیں سر کی جاسکتی ہیں۔

بچہ جن کاموں سے ڈرتا ہے ان سے بچنے کی بجائے اسے ان کا سامنا کرنے دیں خوف رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔

پریشان رہنے کی عادت چھوڑیں:

بچے ہمارا مستقبل ہیں اور پریشان رہنے سے ہمارا مستقبل تباہ ہو جاتا ہے، والدین یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی پریشانی کا دائرہ انہیں تک محدود ہے جب کہ حقیقت اس سے مختلف ہے، جب ہم پریشان ہوتے ہیں تو اس کا غیر ارادی اثر ہمارے ملنے جلنے والوں بالخصوص گھر والوں پر پڑتا ہے، بچے نازک کلیوں کی مانند ہوتے ہیں، آپ کے پریشان او راترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر یہ کلیاں مرجھا جاتی ہیں، آپ اپنی زندگی کی تمام تر ذمہ داریوں کو قبول کرتے ہوئے اپنے کاروبار اور کام سے محبت کریں پریشانیاں خود بخود دور ہو جائیں گی، بچوں کی معیاری ذہنی نشوونما اور فکری ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ انہیں ایک خوش گوار اور مناسب ماحول فراہم کیا جائے جو ان کے سیکھنے میں معاون ہو اور ان کی پوشیدہ صلاحیتیں کھل کر سامنے آسکیں، خوشیاں بازار سے نہیں ملتیں، انہیں گھر میں خود پیدا کرنا پڑتا ہے، آپ کا مسکراتا ہوا چہرہ کتنے دلوں کو سکون اور کتنے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے، اس لئے ہمیں بچوں کی تربیت کے لئے سب سے پہلے خود کو بدلنا ہوگا اور گھر کے ماحول کو ایسا بنانا ہوگا جو بچے کے واسطے مثالی اور قابل عمل ہو۔

مراثی وفات غالبؔ وقطعات تاریخ وفات

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دوعدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

نام کتاب: مراثی وفاتِ غالبؔ

مرتب: آصف ظفر

مبصر: مولانا انصار احمد معروفی

صفحات: ۲۰۰

قیمت: ۳۰۰/روپے

ملنے کا پتہ: فہیم بک ڈپو۔ صدر چوک مئوناتھ بھنجن (یوپی)

مرزا غالبؔ کی حیات وشاعری پر اتنا کام ہو چکا ہے کہ کہنے کو کہہ دیا جاتا ہے کہ ''اب ان کی حیات وخدمات'' کے تعلق سے کوئی گوشہ باقی نہیں رہ گیا ہے جس پر اضافہ کیا جا سکے اور جسے حقیقی معنی میں ''کام'' کہا جا سکے، اگر چہ یہ بات درست ہے، اور یقیناً غالب ایسے شاعر اور نثر نگار تھے کہ جن کی خدمات کی گہرائی و گیرائی کسی سمندر کی تہ در تہ موجوں کی طرح معانی و مفاہیم کا ایسا خزانہ چھپائے ہوئے ہے کہ ہر دور کے قلم کاروں اور ناقدوں کی خاطر اس میں بہت کچھ کریدنے، پھیلانے کے مواقع اور نئے نئے معانی ومفاہیم کی جستجو کرنے والوں کے لیے بہت کچھ گنجائش اور میدان موجود ہے، یقیناً تحقیق وجستجو، علم کا وہ سمندر بے کنار ہے جس کے تیراک کبھی تھک نہیں سکتے اور جس کی اتھاہ گہرائی ووسعت کا ملنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالبؔ کے اوپر کام کرنے والوں کے لیے خدمت کا کوئی نہ کوئی میدان ایسا مل جاتا ہے جو یا تو بے نقش پا رہتا ہے، یا اس موضوع سے متعلق خدمات نہ کے برابر رہتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک نوجوان مصنف آصف ظفر؛ جنہوں نے فارسی اور اردو میں ایم فل کی ہے، انہوں نے حال ہی میں (2019) میں غالب سے متعلق ایک کتاب ''مراثی وفات غالب مع قطعات تاریخ وفات غالب'' مرتب کی ہے، جس میں اب تک کے دستیاب شعرا کے مراثی و قطعات تاریخ وفات کو انہوں نے بہت ہی عرق ریزی سے بالتفصیل جمع کیا ہے، ان کو دوران طالب علمی اساتذۂ کرام اور محققین کی ہدایات اور مطالعۂ غالب وغالبیات سے یہ احساس ہوا کہ ان پر ابھی اور کام کرنے کی گنجائش موجود ہے، کیوں کہ آصف ظفر نے ''مولوی مہیش پرشاد بحیثیت غالب شناس'' کے موضوع پر ایم فل اردو کے لیے تحقیقی مقالہ تیار کیا تھا، اس لیے انہیں اس میدان سے دلچسپی اور غالب سے قلبی محبت کے باعث ان کے مراثی پر کام کرنے کا دل میں ارادہ پیدا ہوا'' چنانچہ لکھتے ہیں ''مجھے تفتہؔ کا مرثیۂ غالبؔ دیکھنے کو ملا اور یہ خیال آیا کہ غالب کی وفات کے بعد خود ان کے تلامذہ اور دیگر مشہور ومعروف شعرا نے مرثیے اور تاریخی قطعات کہے ہیں، کیوں نہ ان سب کو کتابی شکل میں جمع کیا جائے''۔ آصف ظفر نے یہ کتاب مرزا غالب سے دلی محبت کے طفیل لکھی ہے، وہ اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں

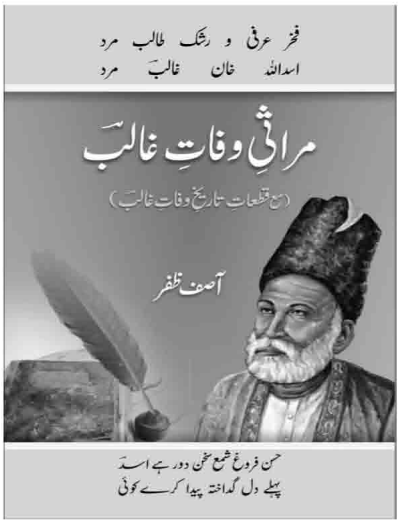

''قارئین کی خدمت میں اس کتاب کو پیش کر کے مجھے غالب شناس ہونے کا دعویٰ کرنا مقصود نہیں بلکہ یہ کتاب غالبؔ سے میری گہری عقیدت کا ایک مظہر ہے''۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے حیات غالب کے آخری ایام، علالت اور وفات اور پھر تعزیت نامے پیش کیے ہیں، اس کے بعد شخصی مرثیے کی تعریف اور اس کی ابتدا کے متعلق معلومات مستند حوالوں سے پیش کی ہے، اور پھر تحریر کیا ہے کہ'' اردو اور فارسی میں اس روایت کو فروغ دینے میں مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ اور ان کے تلامذہ کو خصوصی طور پر اہمیت حاصل ہے''۔ غالب کے شاگردوں میں منشی ہرگوپال تفتہؔ، میر مہدی مجروحؔ، مولانا الطاف حسین حالیؔ، مرزا قربان علی سالکؔ نے شخصی مرثیہ گوئی کو آگے بڑھایا، ان کے مراثی و قطعات تاریخ وفات اس کتاب میں شامل ہیں، ان کے علاوہ غالبؔ کے اور بھی کئی شاگردوں، ہم عصر شعرا کے بھی مراثی اس کتاب کی زینت ہیں، جن کی تعداد تقریباً چالیس ہے، یہ وہ شعرا ہیں جو دہلی اور اس کے اطراف و جوانب کے علاوہ دور دراز کے مقامات پر آباد تھے اور حضرت غالب سے قلبی تعلق اور عقیدت رکھتے تھے، لیکن ان میں مولانا محمد حسین آزادؔ کا قطعۂ تاریخ بھی شامل ہے، جن کے بارے میں مرتب کتاب نے تحریر کیا ہے ''اگرچہ ان (آزاد) کے استاد ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ اور غالبؔ کے درمیان معاصرانہ چشمک رہی لیکن جب غالبؔ کی وفات ہوئی تو آزادؔ نے ان پر فارسی میں قطعۂ تاریخ لکھ کر ان کو خراج تحسین پیش کیا جس میں ان کے وفور غم کا اظہار بھی ہوتا ہے''۔ ص ۱۸۷۔

کتاب میں سب سے پہلے مرثیے کا ذکر ہے جو منشی ہرگوپال تفتہؔ کا ہے، جو غالبؔ کے شاگرد ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے بے تکلف دوستوں کی طرح تھے، تمام شعرا کے تعارف کی طرح پہلے ان کا تعارف مذکور ہے، پھر مرثیہ کا بیان ہے، یہ فارسی میں ہے، یہ ترجیع بند مرثیہ پندرہ بند اور بند کا شعر ملا کر کے کل (390) اشعار پر مشتمل ہے، جو پہلی بار ''اودھ اخبار لکھنؤ میں ۲۶/ اکتوبر ۱۸۶۹ء میں یعنی غالب کی وفات سے نو ماہ بعد شائع ہوا، اس کا دو پر درد شعر یوں ہے:۔

اسد اللہ خاں نہ تنہا رفت
ہمرہش جان ما، دل ما رفت
آنچہ بر من نہ از وفات کسے
پیش ازیں رفتہ بود، حالا رفت

انہوں نے تاریخی قطعہ بھی کہا ہے:۔

اے کہ گوئی ہزار نالا کنم
در غم آنکہ عشرت از دل برد
گرد و صد کم کنی شود تاریخ
اسد اللہ خاں غالب مُرد ۱۸۶۹ء

اس کے بعد میر مجروحؔ کا مرثیہ مذکور ہے، جو اردو میں ہے، یہ مرثیہ بھی دہلی کے ''اکمل الاخبار'' میں ۲۰/ جولائی ۱۸۶۹ء میں شائع ہوا تھا، یہ ۸۰/ اشعار پر مشتمل ہے، اس کے دو شعر یوں ہیں:۔

عرصۂ نظم کیوں نہ ہو ویراں؟
ہے عناں کش وہ شہسوار سخن
ساتھ ان کے گئی سخن سنجی
ان کا مرقد ہی ہے مزار سخن

قطعۂ تاریخ :۔

کل حسرت و افسوس میں میں بادل محزوں
تھا تربت استاد پہ بیٹھا ہوا غم ناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروحؔ
ہاتف نے کہا ''گنج معانی ہے تہِ خاک ۱۲۸۵ھ

مولانا الطاف حسین حالیؔ:۔

اس کے مرنے سے مرگئی دلی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اس کی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

تاریخ وفات:

"تاریخ" ہم نکال چکے پڑھ "بغیر فکر"
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" ۱۲۸۵ھ

مرزا قربان علی سالک:

گل ہیں لیکن نہیں بہار نظر
رنگ گویا کہ گلستاں سے گیا
دل ہے لیکن نہیں ہے دل کو قرار
صبر گویا کہ اپنی جاں سے گیا

تاریخی قطعات برآمد کرنے والے کچھ شعرا نے صرف ہجری اور بعض نے عیسوی سن کے حساب سے قطعات کہے ہیں، البتہ کچھ شعرا نے اس بات کا بھی لحاظ رکھا ہے کہ عیسوی اور ہجری سن میں سے دونوں کا اعتبار کرتے ہوئے دونوں کو ملحوظ رکھا ہے اور اپنی فنی قابلیت کا اظہار کیا ہے۔ جب کہ قدر بلگرامی (تلمیذ غالب۔۱۸۳۳ء۔۱۸۸۴ء) جن کی کتاب " قواعد العروض" ....

(بقیہ ص:۳۵/پر)

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر
UNANI CENTER FOR CARDIAC CARE

Consultation Time
Morning 9:00 am to 3:00 pm
(Friday closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowki Hyderabad - 500008 T.S India

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم (اقامتی وغیر اقامتی ادارہ)

شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد

زیر انتظام : شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Ac No: 1327104000065876 Bank Name: IDBI
Ac N: SHIBLI INTERNATIONAL ADUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFS: IBkL0001327. Branch: Charminar Hyderabad (T.S)

بانی وناظم: مولانا ڈاکٹر مفتی محمد محامد ہلال اعظمی۔ موبائل: 9392533661